دارُالاشاعت الاسلامیہ لاہور

کا مقصد

عُلومِ قرآنی کی عُمومی نشرواشاعت

ہے : تاکہ

① عوام کی توجہات قرآن حکیم کی جانب مُنعطف ہوں، ذہنوں پر اُس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اُس کی محبت جاگزیں ہو ——— اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے۔

② بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں اور اُن میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پُوری زندگی اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشرواشاعت کیلئے وقف کر دیں ؛

تاکہ

ایک عظیم الشان قرآن اکیڈمی کے قیام

کی راہ ہموار ہو سکے !

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

اسرار احمد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تذکرہ و تبصرہ

زیر نظر شمارے کے ساتھ ' میثاق ' کو راقم الحروف کے زیرِ ادارت شائع ہوتے پورے تین سال ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں کسی علمی و دینی ماہنامے کو چلانا خصوصاً جبکہ نہ وہ کسی خاص فرقے کا ترجمان ہو نہ اسے کسی خاص گروہ کی پشت پناہی حاصل ہو، جس قدر کٹھن ہے اس کا اندازہ چنداں مشکل نہیں ——— مختصراً یہ کہ یہ فی الواقع ایک کمر توڑ دینے والی مشقت ہے۔ اور اس میدان میں قدم جمائے رکھنا بغیر اس کے قطعاً ممکن نہیں کہ کسی عظیم مقصد کے لئے ایک شدید داعیہ اور زور دار داخلی تقاضہ موجود ہو جو مسلسل ہر طرح کی مشکلات و موانع سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ پیدا کرتا رہے ——— راقم ایک نہایت کمزور اور ضعیف انسان ہے۔ چنانچہ ان مقاصد سے شدید ذہنی اور قلبی وابستگی کے باوجود جن کے تحت ' میثاق ' کا اجراء عمل میں آیا تھا اور جن کے حصول کے لئے یہ مسلسل کوشاں رہا ہے، تین سال کے اس عرصے کے دوران متعدد بار ایسا ہوا کہ ہمت بالکل جواب دے گئی اور ذہن نے ان خطوط پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا کہ کیوں نہ اسے بند ہی کر دیا جائے۔ تاہم ہر بار اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم آڑے آتا رہا۔ چنانچہ ٹوٹی ہوئی ہمت از سرِ نو بندھتی اور کمزور پڑتا ہوا ارادہ از سرِ نو استوار ہوتا رہا ——— اور نہ صرف یہ کہ گاڑی جوں توں چلتی رہی، بلکہ " قبض " کے ہر جھٹکے کی کوکھ سے جو " بسط " برآمد ہوا اس میں ایک قدم آگے ہی اٹھتا رہا ——— چنانچہ اس کی ضخامت پہلے چھپن سے چونسٹھ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر اسی صفحات ہوئی۔ اور پہلے پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور پھر ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب ایسے اصحاب فکر و قلم کا تعاون اسے حاصل ہوا ——— ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ !

جس طرح کسی ملک اور قوم کے لئے کسی بڑی قوم یا عظیم تر مملکت کی گود میں جا گرنا نہایت آسان ہوتا ہے۔ لیکن آزادی حاصل کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کے لئے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے ———

اسی طرح ایک فرد کے لئے کسی منظم گروہ یا محکم جمعیت و جماعت کا تابع محمل بن کر رہنا بہت آسان ہے اور اس میں نام و نمود اور عزت و شہرت بھی بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں اور روپے پیسے اور مراعات و مفادات کی بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ——— لیکن اپنی آزادیٔ رائے کو برقرار رکھنا اور جملہ معاملات و مسائل میں بالکل آزادانہ غور و فکر کے راستے پر گامزن رہنا اور اسے بیان کرنا نہایت کٹھن اور صبر آزما کام ہے ——— خصوصاً صحافت کے میدان میں، خواہ وہ سیاسی ہو خواہ مذہبی۔ حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کا برقرار رکھنا نہایت پُرصعوبت راہ ہے ——— خاص طور پر ہمارے یہاں، جہاں صدیوں سے ہر میدان میں جمود اور تقلیدِ محض کا دور دورہ ہے یہاں تک کہ جمود اور تقلید کو گویا ہماری قومی روایت اور قومی شعار کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے سے زیادہ پُرخطر راہ اور کوئی نہیں ——— اس میں انسان کو غیروں ہی کی نہیں بسا اوقات اپنوں کی عداوت و دشمنی بھی باقاعدہ 'مول' لینی پڑتی ہے، اور کسی بھی تعاون، امداد اور سہارے کے بغیر خالصتاً اپنے زورِ بازو اور صرف ذاتی ہمت و استقامت پر انحصار کرنا پڑتا ہے ——— تاہم آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر بجائے خود اللہ تعالیٰ کی ایسی عظیم نعمتوں میں سے ہیں جو کسی قیمت پر بھی گراں نہیں۔ کسی بھی معاملے میں آزادانہ غور و فکر اور پھر دیانت کے ساتھ اپنی آزادانہ رائے کے اظہار سے جو خوشی انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ تمام محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا بھرپور ثمرہ ہے۔

اپنی صحافتی زندگی کے چوتھے سال کے آغاز پر خیال تھا کہ قدرے تفصیل سے عرض کیا جائے کہ راقم نے اس دشتِ جنوں میں کن مقاصد کے تحت قدم رکھا تھا۔ تین سال کے عرصے میں اس راہ کی کتنی مسافت قطع ہوئی۔ اب ہم کس مقام پر ہیں اور آئندہ کیا پیشِ نظر ہے۔ لیکن عین وقت پر بعض مجبوریاں ایسی حائل ہو گئیں کہ اس ماہ قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں راقم کی حاضری صرف خانہ پری کے طور پر ہو سکی ہے۔ آئندہ کسی مناسب موقع پر ان شاء اللہ اس موضوع پر مفصل گفتگو ہوگی۔

پاکستان کے سیاسی حالات اور خصوصاً اواخر ۶۸ء اور اوائل ۶۹ء کے دورِ اضطراب کے بارے میں جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا تھا، وہ ہرگز کسی گروہ کی طے کردہ پالیسی یا متعین نقطۂ نظر کی حیثیت حاصل نہیں، بلکہ وہ خالصتاً راقم کی ذاتی رائے تھی جس سے خود راقم کے بزرگوں اور دوستوں میں سے بعض کو اتفاق رہا تو بعض کو اختلاف بھی رہا ——— بہرحال وہ ایک دور تھا جو گزر گیا۔ اور اب 'مملکتِ اسلامیہ پاکستان' ایک بالکل نئے مرحلے سے دوچار ہے۔ اس دورِ نو کے آغاز پر جو کچھ ہم نے گزشتہ ماہ عرض کیا تھا اس کے بارے میں بھی ہمارے بعض دوستوں کو

شکایت ہے کہ اس پر مایوسی کا رنگ غالب ہے اور اس سے پڑھنے والوں میں بے دلی اور ناامیدی پیدا ہوتی ہے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری نگاہ معاملات و مسائل کے تاریک رخ پر زیادہ رہتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے قومی و ملکی حالات مسلسل جس رخ پر بڑھتے رہے ہیں، ان کے پیشِ نظر ہر موقع اور مرحلے پر بالآخر ہماری تاریک بینی ہی درست اور مطابقِ واقعہ ثابت ہوئی۔ اور مذہبی اور قومی ہر اعتبار سے ہمارا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ تاآنکہ اس وقت جس ذہنی و فکری انتشار سے ہم دوچار ہیں اور ملکی سیاست کے میدان میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر واقعہ یہ ہے کہ بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی!

مولانا بھاشانی اور ان کی جماعت کا ذکر چھوڑیے کہ وہ سیاسی کم اور انقلابی زیادہ ہیں۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی کا تذکرہ بھی اس وقت رہنے دیجئے کہ اس کے بارے میں تو ع

"ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی!"

وہ اصل قومی تحریک جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا جس انتشار سے دوچار ہے اسے دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قدرت کا کوئی خاص فضل و کرم ہی ہے کہ پاکستان قائم ہے۔ ورنہ پاکستان کی 'ماں' نے تو خود ہی 'ڈائن' بن کر اسے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے کوکھ سے عوامی لیگ برآمد ہوئی تھی۔ ماضی قریب میں مسلم لیگیں بھی دو ہو گئیں اور عوامی بھی۔ گویا کل چار لیگیں وجود میں آ گئیں۔ گزشتہ دورِ اضطراب کے بعد امید ہوتی تھی کہ شاید لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں اور یہ قومی تحریک اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرے۔ لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"! اس دورِ اضطراب سے باہر نکلتے ہی لیگوں کی تعداد مزید بڑھ گئی — اور ایک تیسری مسلم لیگ وجود میں آ گئی — ابھی یہ تو وہ ہیں جنہوں نے "لیگ" کے نام کو بہرحال ایک مقدس ورثے کی حیثیت سے سینے سے لگائے رکھا ہے، ورنہ اسی قومی تحریک سے جو دوسری شاخیں نظامِ اسلام پارٹی، این ڈی ایف اور متعدد 'عوامی' پارٹیوں کی صورت میں پھوٹی ہیں ان سب کا شمار کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے!

ان حالات میں حقیقت یہ ہے کہ ذہن سوچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہمت جواب دے جاتی ہے کہ جس قوم نے گزشتہ ہنگاموں سے بھی سبق حاصل نہ کیا ——— وہ قانونِ قدرت کے کس کوڑے کا انتظار کر رہی ہے ——— مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو صرف اس خیال سے کہ ہمارے پاس نوعِ انسانی کے لئے ایک پیغام ہے — اور اگر کسی طرح ہم اس پیغام کے داعی بن کر کھڑے ہو سکیں اور اس قوم میں داعیانہ جذبہ بیدار ہو جائے تو یہ جذبہ ہمارے تمام امراض کا علاج ہے اور اس کے ذریعے ہمارے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

اتفاق سے اس موضوع پر محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی ایک تحریر ہمیں دستیاب ہو گئی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے عرب بھائیوں سے خطاب کر کے لکھی۔ اس میں مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام — اور ان کے مسائل کے حل کی اصل صورت جو پیش کی گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ اس پر ہر مسلمان سنجیدگی سے غور کرے۔ چنانچہ ڈاکٹر کی یہ تحریر 'تذکرہ و تبصرہ' کے جزو کی حیثیت ہی سے پیش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

عالمی صہیونیت اور اسرائیل کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟

ڈاکٹر صاحب گذشتہ عالمی اسلامی کانفرنس میں جو انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ قاہرہ کے زیر اہتمام گذشتہ سال منعقد ہوئی تھی شرکت کے لئے حکومت پاکستان کی طرف سے منتخب ہوئے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے قاہرہ نہیں جا سکے۔ اس کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے جو مقالہ انہوں نے لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اگر پوچھا جائے کہ ہمیں عالمی صہیونیت اور اسرائیل کا مقابلہ کیسے کرنا چاہئے تو ہر سمجھ دار آدمی اس سوال کا جواب یہ دے گا کہ سب سے پہلے ہمیں آپس میں پوری طرح سے متحد اور منظم ہونا چاہئے اور جنگ کے وقت پوری ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کے لئے مناسب تدبیروں کو پہلے ہی سے سوچ لینا چاہئے اور اس بات کی پوری مشق کر لینی چاہئے کہ وقت آنے پر ان کو جامہ عمل کس طرح پہنایا جائے گا۔ پھر ہمیں اپنے ایسے راز ہائے سربستہ کو پوری کوشش سے چھپا کر رکھنا چاہئے جن کا جان لینا دشمن کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ چونکہ کوئی جنگ فیصلہ کن نہیں ہو سکتی اور یہ ایک قطعی امر ہے کہ اسرائیل فیصلہ کے لئے ہمیں لازماً پھر ایک بڑی جنگ میں الجھائے گا۔ لہٰذا اس جنگ کی توقع کے پیش نظر ہمیں اپنے زیادہ سے زیادہ ذرائع کو کام میں لا کر اپنے آپ کو فوجی نقطہ نظر سے پوری طرح تیار کرنا چاہئے اور اپنی افواج کی تربیت اس طرح سے کرنی چاہئے کہ وہ ہر حالت میں اپنے نظم اور ضبط کو قائم رکھیں اور ہر طرح کی تکالیف پر صبر کریں اور جان سے بے پروا ہو کر لڑیں۔

یہ سب باتیں بالکل درست ہیں اور ہم ان میں سے کسی ایک بات کو بھی کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن اسرائیل کے ساتھ ہماری گذشتہ دو جنگوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اسرائیل تن تنہا نہیں بلکہ دنیا کی کئی بڑی بڑی سلطنتیں اس کی مددگار ہیں۔ ان ہی طاقتوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی وجہ سے اسرائیل نے عربوں کے ہتھیائے ہوئے علاقے واپس نہیں کئے اور یروشلم کا الحاق کرنے کی جسارت کی ہے۔ درحقیقت ان ہی طاقتوں نے اسرائیل کو جنم دیا ہے لہٰذا یہ طاقتیں ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں کہ اسرائیل مٹ جائے یا کمزور رہے۔ یا عربوں کے بالمقابل ایک بڑی طاقت کے

حقوق اور امتیازات سے محروم رہے بلکہ درپردہ ان طاقتوں کی خواہش یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسرائیل عربوں کے زیادہ سے زیادہ وسیع علاقوں پر قابض ہو جائے۔ حال ہی میں امریکہ کے وائس پریذیڈنٹ ہیوبرٹ ہمفری نے بڑے زور سے کہا ہے کہ :-

"امریکہ کو چاہئے کہ وہ اسرائیل کو فوق الصوت جیٹ طیارے جب تک کہ اسرائیل ان کی ضرورت محسوس کرے بار بار بھیجتا رہے۔ اور عرب ممالک کو کسی حالت میں بھی اسرائیل سے زیادہ طاقتور ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔"

پھر اسرائیل کے ساتھ ہماری گذشتہ دو جنگوں نے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ وہ لوگ جو امن کی حالت میں اسرائیل کے خلاف ہماری دوستی کا دم بھرتے ہوں، ضروری نہیں کہ وہ جنگ کے وقت بھی کھلم کھلا ہماری امداد کو نکل آئیں۔ لہٰذا مخصوص حالات میں ہمیں اپنی ہی فوجی طاقت اور جرأت اور ہمت پر انحصار کرنا ہوگا۔

ایسے حالات میں ہم جنگ میں مکمل فتح حاصل کرنے کی امید صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں، جبکہ ہماری فوجی طاقت نہ صرف اسرائیل سے بلکہ اس کے حلیفوں اور مددگاروں سے بھی زیادہ ہو ورنہ اسرائیل ممکن ہے کہ روک دیا جائے لیکن یہ مٹایا نہیں جا سکے گا اور جب تک وہ مٹایا نہ جائے وہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ بنا رہے گا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ اتنی فوجی قوت بہم پہنچانا جو اسرائیل اور دنیا کی بڑی بڑی مددگار طاقتوں کی مجموعی قوت سے بھی زیادہ ہو مشکل سا کام ہے۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم دشمن کو کبھی مکمل طور پر مفتوح اور مغلوب نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فوجی اسلحہ کے علاوہ دشمن کو مغلوب اور مفتوح کرنے کا ایک اور حربہ بھی قدرت کے کارخانہ میں موجود ہے اور یہ حربہ تمام دنیا کے مجموعی فوجی اسلحہ سے بھی کئی گنا زیادہ قوی ہے۔ وہ فوجی اسلحہ سے زیادہ سریع الحرکت ہے اور اس کی حرکت ہر قسم کی طبعی، سیاسی اور جغرافیائی حدود و قیود اور دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں اور صحراؤں کی رکاوٹوں کے باوجود جاری رہتی ہے۔ اس کے استعمال سے دشمنوں کے دلوں کو مسخر کیا جا سکتا ہے جس سے ان کی قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے اور ان کے ہاتھ اٹھنے سے اور ان کے پاؤں چلنے سے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنے آلات حرب و ضرب کو خوشی خوشی اپنے مخالفین کو سپرد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ دشمن نہیں رہتے بلکہ معاون اور مددگار بن جاتے ہیں۔ یہ ہتھیار دلکش افکار و تصورات کی قوت ہے۔ یہ قوت قوموں کی باہمی جنگ میں فیصلہ کن ہے۔ آخرکار دنیا میں وہی قوم سب پر غالب رہے گی جس کے پاس ایسا تصور ہوگا جو تمام دوسرے تصورات سے زیادہ دلکش اور دلنشین ہوگا۔ اور فطرت انسانی کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والا اور فطرت انسانی کو سب سے زیادہ مطمئن کرنے والا ثابت ہوگا۔

یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ سچائی کا عاشق ہے اور اگر سچائی اس کے سامنے اس طرح سے آجائے کہ وہ اس کو جان لے اور پہچان لے تو پھر اس کو کبھی ترک نہیں کر سکتا۔ اس کا دیوانہ بن جاتا ہے اور اس کی خاطر اپنے تمام دوسرے تصورات اور نظریات کو ترک کر دیتا ہے جو اس سے متصادم ہو رہے ہوں۔ اور پھر یہ بات بھی مسلّم ہے کہ ہر قوم کی راہ نمائی کرنے والے لوگ وہی ہوتے ہیں جو علمی اور عقلی استعدادوں میں سب سے اونچے ہیں۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جو سب سے پہلے سچے تصورات سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کو قبول کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جدھر یہ جائیں بلا تردد اُدھر ہی چل پڑتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ ہم ایک ایسا تصور دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو اس قدر معقول اور مدلّل ہے اس قدر صحیح اور سچا ہے کہ تمام سائنسی علوم کے حقائق مثلاً طبیعیاتی علوم، حیاتیاتی علوم اور نفسیاتی علوم کے تمام حقائق جن میں فلسفہ سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تعلیم، فلسفہ اقتصادیات، فلسفہ قانون، فلسفہ تاریخ، نفسیات فرد اور نفسیات جماعت کے تمام حقائق بھی شامل ہیں، سب مل کر اس کی صداقت کو نوعِ انسانی کے تمام تعلیم یافتہ افراد کے لئے بغیر کسی بحث اور اختلاف کے اور قطعی اور یقینی طور پر ثابت کر رہے ہوں، جیسے یہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہی وہ تصور ہے جو انسان کی ساری علمی، اخلاقی، روحانی اور جمالیاتی تمنا، وہ کا مقصود اور مدعا ہے جو اس کو مکمل طور پر مطمئن کر سکتا ہے اور یہی وہ تصور ہے جو بلاشبہ اس کے تمام اعمال و افعال کی اصل قوتِ محرکہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تصور کی مزاحمت ناممکن ہوگی اور وہ جادو کی چھڑی کی طرح کام کرے گا کہ جہاں کوئی شخص اس سے چھوئے گا وہیں بدل جائے گا۔

پھر فرض کیجئے کہ ہمیں ایک ایسا تعلیمی ذریعہ مل جاتا ہے جس سے ہم بغیر کسی زحمت کے یہ تصور اپنی نئی نسل کے تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کے دلوں میں اس طرح سے اتار دیتے ہیں کہ وہ اس کی محبت سے مخمور اور سرشار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمام دنیاوی آسائشوں سے بے پرواہ ہو کر اس تصور کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے ایک منظم اور مستعد فوج بن جاتے ہیں اور کتابوں، رسالوں، اخباروں، تقریروں، تبلیغی دوروں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذرائع سے دنیا بھر میں اس تصور کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ، انگلستان اور اسرائیل کے چوٹی کے تعلیم یافتہ لوگ اپنے اپنے تصورات کو چھوڑ کر اس تصور کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اسرائیل اور اس کے مددگاروں کی تمام مخالفت ختم ہو جائے گی بلکہ دنیا بھر میں ہمارا کوئی مخالف نہیں رہے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا تصور دنیا میں کہیں موجود ہے اور کیا وہ ہمیں میسر آ سکتا ہے۔ یہ تصور یقیناً موجود ہے اور دنیا میں صرف ایک قوم ایسی ہے جس کو یہ تصور اپنی اصلی اور پاکیزہ حالت میں دیا گیا ہے۔

وہ قوم مسلمان قوم ہے اور وہ تصور خدا کا تصور ہے۔ اور دوسرا کوئی تصور ایسا نہیں جو ان شرائط کو پورا کر سکے۔ دنیا میں کسی نظریہ حیات نے اور کسی مذہب نے خدا کے تصور کو تمام غلطیوں سے پاک اور شرک کے تمام شوائب سے منزہ رکھنے پر اتنا زور نہیں دیا جتنا کہ اسلام نے دیا ہے۔ اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں میں سائنسی علوم کی نصابی کتابوں یعنی طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کی نصابی کتابوں کے اندر خدا کے تصور کو اپنے مقام پر لے آئیں تو پھر تمام سائنسی حقائق خدا کے تصور کی صداقت کے ناقابل انکار دلائل بن جاتے ہیں اور یہ قطعی اور آخری طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہی تصور ہے جو انسان کے تمام اعمال و افعال کا سرچشمہ ہے ایسی حالت میں ناممکن ہو جاتا ہے کہ ان نصابی کتابوں کو پڑھنے والا طالب علم خدا کی محبت کا دیوانہ نہ بن جائے۔ سچائی کی کشش بے پناہ ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کشش کے عمل کو روک نہیں سکتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف سائنسی علوم میں خدا کے تصور کا مقام کیا ہے۔ سائنسی علوم مظاہرِ قدرت کے علوم ہیں اور قرآن حکیم نے مظاہرِ قدرت کو بجا وجہ خدا کے نشانات قرار نہیں دیا۔ ہر مظہرِ قدرت ایک سوال پیدا کرتا ہے جس کا جواب خدا ہے۔ مثلاً ہر مادی مظہرِ قدرت کے اندر ایک نظم موجود ہے۔ اگر مادی مظاہرِ قدرت کے اندر نظم نہ ہوتا تو طبیعیات کی سائنس ممکن نہ ہوتی۔ لیکن نظم کسی ذہن کی تخلیقی کارروائی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر گندم کے کچھ دانے زمین پر بکھرے ہوتے ہوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اتفاقاً گر گئے ہوں گے۔ لیکن اگر وہی دانے ایک باقاعدہ ہشت پہلو شکل میں آراستہ ہوں تو ہمارے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں ہوتا کہ ہم یہ سمجھیں کہ یہ کسی ذہن کی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مادی مظہرِ قدرت یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ وہ کس کا ذہن ہے جس نے اس کے اندر نظم (ORDER) پیدا کیا ہے۔ طبیعیات کی نصابی کتاب لکھنے والے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ یہ جواب دے کہ اس نظم کا خالق خدا ہے۔

اسی طرح سے ہر حیاتیاتی مظہرِ قدرت یا زندہ حیوان ایک مقصد کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے جو حیوان کے علم کے بغیر اس کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ وہ حیوان کا اپنا مقصد نہیں ہوتا کیونکہ حیوان اس مقصد کے تابع رہتا ہے۔ لہٰذا ہر حیاتیاتی مظہرِ قدرت یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ یہ کس کا مقصد ہے جو اس کے اندر کارفرما ہے۔ حیاتیات کی نصابی کتاب لکھنے والا طالب علم کو اور اپنی سائنس کو تشنہ رکھے گا اگر وہ اس سوال کے جواب پر خاموش رہے۔ یا اس کا جواب دیتے ہوئے یہ نہ بتائے کہ یہ مقصد خدا کا ہے۔ اسی طرح سے نفسیاتی اور انسانی حقائق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ ایک ایسا تصور ہوتا ہے جس کی طرف انسان تمام صفاتِ حسن و کمال منسوب کرتا ہے۔ لہٰذا نفسیاتی اور انسانی علوم کی نصابی کتابوں میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خود خدا کی اصطلاح کی تعریف کی رُو سے یہ تصور صرف خدا کا ہو سکتا ہے۔

اوپر میں نے مجمل طور پر عرض کیا ہے کہ خدا کا تصور سائنس کی نصابی کتابوں میں کہاں اور کیسے آتا ہے۔ لیکن اس سوال کا تفصیلی جواب تو وہی ماہرین دیں گے جو اس نکتۂ نظر کے مطابق نصابی کتابوں کی تالیف کرنے بیٹھیں گے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اب یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے سائنس دان جنہوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی اسپین کے مسلمان تھے۔ انہوں نے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس لئے کیا تھا کہ قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ مظاہر قدرت خدا کے نشانات ہیں اور ان کا مشاہدہ اور مطالعہ خدا پر ایمان لانے کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا ان مسلمانوں کی سائنس کا مدار و محور خدا کا تصور تھا۔ جب یہ مسلمان اسپین سے رخصت ہوئے تو سائنس قدرتی طور پر یورپ کے عیسائیوں کے ہاتھ آئی۔ چونکہ عیسائیوں کے نزدیک دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور ایک پاک ہے اور دوسری ناپاک۔ سائنس دنیا سے تعلق رکھتی ہے اور خدا کا تصور دین سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے پاک کو ناپاک سے الگ کرنے کے لئے خدا کا تصور سائنس سے جدا کر دیا۔ لیکن اسلام قدرت کو ناپاک نہیں سمجھتا۔ بلکہ قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ کو خدا کی معرفت کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں میں خدا کے تصور کو پھر اپنی جگہ پر لے آئیں تو یہ بات نئی نہ ہوگی بلکہ قرآن کی تعلیمات اور عقل و علم کے آزمودہ مقتضیات کے عین مطابق ہوگی اور ایسا کرنے سے ہم دنیا کو ایک پُرامن طریق سے اپنا ہم خیال بنا سکیں گے۔

ان معروضات کی روشنی میں ہم قرآن حکیم کی ان آیات مبارکہ کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ جن میں بڑے زور کے ساتھ مسلمان قوم کے عالمگیر غلبہ اور ظہور کی پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔

(۱) انتم الاعلون ان کنتم مومنین ٥

(۲) ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ الکٰفرون ٥

(۳) سنریھم آیٰتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق ٥

اعتذار ہمیں افسوس ہے کہ اس مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی تالیف "منشور اسلام" کی متوسط قسط شامل اشاعت نہیں ہوسکی۔ یہ غنیمت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ یا اقتباس دستیاب ہو اور اس طرح پرچے سے ڈاکٹر صاحب کی غیر حاضری نہیں ہوتی۔ (مدیر)

افکار و آراء

پاکستانی سیاست ایک اہم موڑ پر

—— : ماہنامہ 'معارف' اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۶۹ء کا اداریہ : ——

از قلم شاہ معین الدین احمد ندوی

[برِ صغیر ہند و پاک کا کون سا پڑھا لکھا مسلمان ہوگا جو مجلس دار المصنفین، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا کے ماہوار علمی مجلہ "معارف" کے نام سے واقف نہ ہو۔ اس علمی جریدے کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۶۹ء میں اس کے فاضل مدیر شاہ معین الدین احمد ندوی نے پاکستان کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ اگرچہ کسی تحریر کے جملہ مشتملات سے کلی اتفاق تو شاذ ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ تحریر بحیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ پاکستان کا ہر دردمند مسلمان اسے پڑھے اور اس کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کے حالات کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرے ——— اسرار احمد]

• پاکستان کا انقلاب مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی بلکہ بدبختی کا نمونہ ہے۔ دوسرے اسلامی ملکوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا ہے اس انقلاب نے پاکستان کو اس سے کم نقصان نہیں پہنچایا۔ جنرل ایوب خاں میں ضرور خامیاں ہوں گی ورنہ ان کے خلاف اتنا بڑا انقلاب نہ ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہی نے پاکستان کو آئے دن کے انقلاب سے نجات دلائی۔ اس کو استحکام بخشا۔ بیرونی دنیا میں اس کی ساکھ قائم کی اور مختلف حیثیتوں سے اس کو بڑی ترقی دی۔ ان ساری ترقیوں کو موجودہ انقلاب نے برباد کر کے رکھ دیا جس کی تلافی مدتوں میں ہوسکے گی۔ یہ بھی ایوب خاں کا تدبر ہے کہ فوجی جنرل ہوتے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا اور مخالفین کے بنیادی مطالبات مان لئے ورنہ اس سے بھی زیادہ کشت و خون ہوتا۔

ان کے مخالفین نے عوام کے جذبات تو ابھار دیئے لیکن ان کو قابو میں نہ رکھ سکے اور ان میں ایسا جنون پیدا ہوگیا کہ پورے پاکستان میں غدر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کے ناعاقبت اندیش عوام نے خود اپنے بھائیوں پر ایسے وحشیانہ مظالم کئے جن سے روس اور فرانس کے انقلاب کی یاد تازہ ہوگئی۔ اور یہ

کار خیر اس امت کے ہاتھوں انجام پایا جو ساری دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیام لائی تھی۔ اب جمہوریت اور سوشلزم کے علمبرداروں کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے جس آتش فشاں کو بھڑکایا تھا۔ وہ پورے پاکستان کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔ جمہوریت اور سوشلزم کا نعرہ محض ایوب خاں کی مخالفت تک محدود نہیں رہ گیا بلکہ اس نے نسلی، جغرافی، لسانی ہر قسم کی عصبیتوں اور دوسرے فاسد عناصر کو ابھار دیا ہے۔ اگر ان سب کے مطالبات مان لئے جائیں تو پاکستان کا وجود باقی نہ رہے گا۔

عوامی جمہوریت یعنی برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت اور سوشلزم تو خود یورپ کے سب ملکوں میں نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ یہ نظام حکومت ان ہی ترقی یافتہ ملکوں کے لئے مفید ہے جن کا سیاسی شعور پختہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان جیسے غیر تعلیم یافتہ اور پسماندہ ملکوں کے لئے انتہائی مہلک ہے اسی لئے یہ جمہوریت ایشیا کے کسی ملک میں بھی کامیاب نہیں۔ ہندوستان میں اس کی کامیابی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے مگر اس کی کامیابی ملک کی موجودہ بدنظمی اور انتشار سے ظاہر ہے۔ اسی لئے اب ہندوستان کے بہت سے مفکرین اس کے خلاف ہو رہے ہیں۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ یورپ خصوصاً برطانیہ صدیوں کے علم و تجربہ کے بعد جس منزل پر پہنچا ہے۔ ہندوستان و پاکستان چند برسوں میں وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ شیر خوار بچہ کو ثقیل غذائیں کھلائی جائیں۔ اس کا نتیجہ ہلاکت کے سوا کیا نکل سکتا ہے۔ ہم اس جمہوریت اور سوشلزم کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن وہ پاکستان جیسے نومولود ملک کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ اس کے لئے محدود جمہوریت کے ساتھ اچھا صدارتی نظام ہی مناسب ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو وسیع جمہوریت کی طرف بڑھایا جاتے ورنہ اس کے جو تلخ نتائج ایک مرتبہ نکل چکے ہیں وہی آئندہ بھی نکلیں گے۔ لیکن اگر پاکستان کی فلاح اسی میں ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔

لطف یہ ہے کہ اس جمہوریت اور سوشلزم کو اسلام کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے جو سراسر فریب ہے۔ اسلام کا اپنا مستقل نظام ہے جو ان سب سے مختلف، ان کی خرابیوں سے پاک لیکن ان کے صالح عناصر کا جامع ہے۔ اس معنی میں اسلام کا نظام بلاشبہ جمہوری ہے کہ اس میں مطلق العنان آمریت نہیں اور امیر یا حکمراں کے انتخاب اور دوسرے اہم معاملات میں اصحاب رائے کا مشورہ ضروری ہے لیکن بالغ رائے دہندگی نہیں۔ اسی طرح ملکی حقوق میں ملک کے سارے باشندے برابر ہیں لیکن اشخاص کے لئے جائز طریقوں سے حصول دولت پر کوئی پابندی نہیں اور مذہب کے مقرر کردہ صدقات اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکس کی ادائیگی کے بعد ہر شخص اپنی دولت کا مالک رہے گا۔ وہ حکومت کی ملک نہیں بن سکتی۔ درحقیقت اسلام کا مالی اور معاشی نظام اتنا موزوں ہے اور اس نے دولت مندوں پر اتنے فرائض عائد کر دیئے ہیں کہ اگر ان سب پر عمل کیا جائے تو ملک

میں نہ مفرط سرمایہ داری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ غربت و افلاس۔ حیرت ان علماء پر ہے جو اسلامی نظام کی دعوت کے باوجود ان ہی گمراہ کن اصطلاحوں کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

اس وقت ساری دنیا میں کمیونزم، جمہوریت اور سرمایہ داری کی کشمکش ہے۔ اور ان میں ہر فریق ایشیا اور افریقہ میں اپنا اثر قائم کرنے کے لئے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ پاکستان کا انقلاب بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو کمیونزم کے اثرات بالکل نمایاں ہیں۔ وہاں مہاجرین کے خلاف بھی تعصب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کس قدر شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان میں جہاں دینی اخوت کا کوئی تصور نہیں، شرنارتھی اپنے پرانے وطن کی طرح سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پاکستان میں جس کی بنیاد اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے ان دینی بھائیوں کو جن کی قربانیوں کے بدولت پاکستان بنا ہے غیر سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات تصور میں نہیں آ سکتی۔

پاکستان میں نسلی اعتبار سے مختلف قومیں آباد ہیں۔ جن کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ ان میں وحدت کا رشتہ صرف اسلام ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹا تو پھر اس کو کوئی قوت انتشار سے نہیں بچا سکتی۔ موجودہ انقلاب نے اس کی اہمیت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ اس وقت پاکستان میں نہ صرف ہر صوبہ اور ہر نسل بلکہ ہر طبقہ مطالبات کی ایک طویل فہرست لے کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اگر ان کو مان لیا جاتے تو پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور وہ سیاسی حیثیت سے دیوالیہ ہو جائے گا۔ اس کی بقا و استحکام زیادہ سے زیادہ وحدت اور ایک مضبوط مرکزی حکومت پر موقوف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ صوبوں خصوصاً مشرقی پاکستان کی جائز شکایتوں کا ازالہ بھی ضروری ہے اور ایسا حل نکالنے کی ضرورت ہے جس سے پاکستان کی وحدت بھی قائم رہے اور صوبوں کی شکایتیں بھی دور ہو جائیں۔ ورنہ اگر ہر فریق اپنے مطالبات پر اڑا رہا تو پاکستان کی تباہی کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ مشرقی پاکستان تو یقیناً کمیونزم کی گود میں چلا جائے گا اور اس کے نتائج کا اس وقت اس کو اندازہ ہو گا جب اس کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اس وقت ایوب کے مخالفین اور جمہوریت و سوشلزم کے علمبرداروں کے تدبر کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کو اپنا بھلا برا سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو ہر گزند سے محفوظ رکھے۔"

کراچی میں
میثاق
سول ایجنٹ : عوامی کتب خانہ
نزد بولٹن مارکیٹ

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

اسرار احمد

● فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء ● بنیادی نقطہ نظر ● عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش ● مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل ● علوم عمرانی کا ارتقاء ● اسلامی نظام حیات کا فقدان اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں ● تعبیر کی کوتاہی ● احیائے اسلام کی شرط لازم: تجدید ایمان ● کرنے کا اصل کام ● عملی اقدامات اور

مضامین مندرجہ بالا کی تائید و توثیق بعنوان

"فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر"

از قلم پروفیسر یوسف سلیم چشتی

"دونوں مقالے ماہنامہ میثاق (لاہور) میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دونوں فکر انگیز ہیں اور ایک طرف جوش و اخلاص دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے"

مولانا عبدالماجد دریابادی

صدق جدید، ۷ فروری ۱۹۶۹ء

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ صفحات ۵۶ ، طباعت آفسٹ ، قیمت : ایک روپیہ

: شائع کردہ :

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر (سابقہ امرت) روڈ اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ انعام

(۶)

۱۳- آگے کا مضمون، آیات ۹۱-۹۴

اوپر بیان ہوا کہ قرآن توحید اور اسلام کی جو دعوت دے رہا ہے یہ تمام انبیاء کی مشترک دعوت ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اب آگے چند آیتوں میں ان تکذیب کرنے والوں کے رویہ پر تبصرہ فرمایا ہے اور ان کے اقوال کا حوالہ دے کر ان کی لغویت واضح کی ہے۔ ان تکذیب کرنے والوں میں پیش پیش تو قدرتی طور پر رؤسائے مکہ تھے لیکن ابتدا ہی سے یہود نے ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے فروغ میں اصلی خطرہ وہ اپنے ہی لیے سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذہن میں بات تو یہ بیٹھی ہوئی تھی کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا اجارہ ہے، اگر کوئی نبی آنے والا ہی ہے تو بنی اسرائیل میں آئے گا، اس خانوادہ سے باہر کیسے آسکتا ہے۔ اب جو یہ صورت حال ان کے سامنے آئی تو سخت کش مکش میں پڑ گئے کہ اس خطرے کو کیسے دور کریں۔ غیر جانبدار بن کے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا لیکن مخالفت کریں تو کس انداز سے کریں۔ اگر یہ بات کہیں کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا حصہ ہے اور تورات کی موجودگی میں اب کسی اور قرآن یا کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اندیشہ تھا کہ اس سے عربوں کی حمیت بھڑکے گی اور عجب نہیں کہ اس جوش میں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس اندیشے کی بنا پر انہوں نے اپنے دل کی بات تو دل میں رکھی اور آنحضرتؐ کے مخالفین کو شہ دینے کے لیے یوں کہنا شروع کر دیا کہ جو بھی یہ دعوے کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے بالکل برخود غلط ہے، خدا نے کسی پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔ یہ بات وہ کہتے تو تھے اپنے مخصوص ذہنی تحفظ کے ساتھ ہی لیکن اس سیاسی مصلحت سے جس کی طرف

ہم نے اشارہ کیا وہ اس کو ایک عام کلیہ کے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کی یہ شرارت بھی بے نقاب کی اور قریش کے ان متکبرین کو بھی جواب دیا جو محض اپنے غرور سیادت میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے حلقے سے باہر بھی کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جس کو خدا کوئی شرف و عزت بخش سکتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۱-۹۴

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ
شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى
لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ
مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ
خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ
اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ
الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ
وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ
شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ ۹۱-۹۴

ترجمہ

اور انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب کہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے۔ جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو۔ اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا۔ کہہ دو اللہ ہی نے۔ پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیز کی۔

(تاکہ تو خوش خبری دے) اور تاکہ ہوشیار کر دے ام القریٰ اور اس کے ارد گرد والوں کو اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۹۱-۹۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا دعوے کرے کہ مجھ پر وحی آتی ہے درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور اس سے جو دعوے کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے۔ اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا سب تم نے پیچھے چھوڑا اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملے میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارا تعلق بالکل ٹوٹ گیا اور جو چیزیں تم گمان کیے بیٹھے تھے وہ سب ہوا ہو گئیں۔ ۹۳-۹۴

۱۴- الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ
شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ
هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ
وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ
ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ - ۹۱

"ما قدروا الله حق قدره اذ قالوا ما انزل الله على بشر من شیٔ" او پر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قول کہ "اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے" یہود کا ہے۔ اگرچہ ان کے ذہن میں تو بات یہ رہی ہو گی کہ اب موسیٰؑ کی کتاب اور ان کی شریعت کے بعد کسی نئی کتاب و شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یوں صاف صاف بات کہنے میں عربوں کی قومی حمیت کے بھڑکنے کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اندیشہ تھا اس وجہ سے انہوں نے اس پہلو کو

چلاتے ہوئے یوں کہہ دیا کہ خدا نے کسی پر بھی کچھ نہیں اتارا ہے۔ کہ اپنا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور کسی کو کوئی بدگمانی بھی نہ ہو۔ یہاں جواب میں ان کے قول کا ظاہری اور باطنی دونوں ہی پہلو ملحوظ ہے۔

پہلے ان کے قول کے ظاہر الفاظ پر گرفت فرمائی اور اس کی تمہید یوں اٹھائی کہ انہوں نے یہ بات کہہ کر خدا کی قدردانی کا کچھ اچھا ثبوت نہیں دیا۔ اگر یہ بات اہل عرب کہتے تو ان کے لئے تو کچھ عذر ہو سکتا تھا کہ کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ ہیں، اس وجہ سے ایک عامیانہ بات کہہ گزرے لیکن جب یہ بات ان لوگوں نے کہی جو تمام نبیوں اور رسولوں کے وارث اور تمام کتاب و شریعت کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو ثابت ہوا کہ خدا شناسی کے ان مدعیوں نے خدا کو بہت کم پہچانا ہے ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جس خدا نے انسان کے اندر ودیعت کردہ ہر طلب اور ہر تقاضے کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا آخر وہ انسان کے سب سے قوی داعیہ — طلب ہدایت — ہی کی تسکین و تشفی کا سامان کیوں نہ کرتا؟ اس نے ہمیں پیاس دی تو اس کی تسکین کے لیے زمین کے اندر بھی پانی کی سوتیں جاری کر دیں اور آسمان سے بھی اپنی رحمت کی گھٹائیں برسائیں، پھر اس خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کسی پر اپنی ہدایت و شریعت نہیں اتاری، ایک ایسی بات ہے جو وہی کہہ سکتے ہیں جو نہ خدا کی صفتوں سے واقف ہوں اور نہ اس کے ان افضال و عنایات سے جن کے مورد پشتہا پشت سے وہ خود رہ چکے ہیں۔

'قل من انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ نورا و ھدی للناس'
تمہید کے بعد اب یہ ان سے سوال ہے کہ اگر خدا نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ بتائیں کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ لے کر آئے اور جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت بن کر نازل ہوئی۔ اس کے بعد 'تجعلونہ قراطیس تبدونہا و تخفون کثیرا' (جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے اور زیادہ کو چھپاتے ہو) فرما کر ان کی اس ناقدری کا بھی اظہار فرما دیا جو انہوں نے اس کتاب کی کی اور اس سے ضمناً ان کے مذکورہ بالا قول کے باطنی پہلو کا بھی ایک جواب ہو گیا کہ اگر انہوں نے یہ بات یہ پیش نظر رکھ کر کہی ہے کہ اب موسیٰؑ کی کتاب کے بعد کسی اور کتاب و شریعت کی ضرورت نہیں ہے تو ان کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہے اس لئے کہ انہوں نے اس کتاب کی جو قدر کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ورق ورق کر رکھا ہے، اس کے کچھ حصہ کو تو یہ ظاہر کرتے ہیں اور زیادہ حصے کو چھپاتے ہیں تو جو چیز روشنی اور ہدایت بن کر آئی تھی اس کے ساتھ انہوں نے جب یہ سلوک کیا تو آخر خدا اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے کس طرح چھوڑے رکھتا اور وہ روشنی و ہدایت ان کے لیے کیوں نہ نازل فرماتا جو ان کو تاریکی سے نکالے اور گمراہی سے نجات دے۔

اخفائے کتاب کی ایک سازش

'قراطیس' قرطاس کی جمع ہے۔ 'قرطاس' لکھنے کے صحیفہ اور ورق کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ کسی چیز سے بھی بنایا گیا ہو۔ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہوں گی جو اس زمانے میں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ یہ بات یہاں ملحوظ ہے کہ یہود نے تورات اس شکل میں یکجا نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو ما بین الدفتین جمع کیا بلکہ انہوں نے اس کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلمبند کیا تھا۔ اس طرح ان کو اس کی ان تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزاء الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ وہ اس کے جس جزو کو چاہے اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الٰہی کے اخفا کا جو جرم عائد کیا ہے اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ تھی اور قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے۔ اس لیے کہ 'تبدونہا و تخفون کثیرا' کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا تھا وہ زیادہ تھا، اس کے معنی لازماً یہی ہوتے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا وہ تھوڑا تھا۔ اپنی روشنی اور ہدایت اللہ تعالیٰ اس لئے عطا فرماتا ہے کہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں نہ کہ اس لیے کہ اس کو ڈھانک کے رکھا جائے۔ حضرت مسیحؑ اور بعض دوسرے نبیوں نے بھی یہود کے اس اخفائے کتاب پر ان کی سرزنش کی ہے کہ تم کو چراغ اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کو طاق پر رکھو کہ پورے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کے رکھا ہے۔

'وعلمتم ما لم تعلموا انتم ولا اباؤکم' یہ جملہ بھی مذکورۂ اوپر کے استفہامیہ جملہ ہی پر عطف ہے۔ یعنی وہ کون ہے جس نے موسیٰ کو کتاب دی جس کے ذریعہ سے تم کو وہ باتیں بتائی اور سکھائی گئیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ دیدہ دلیری کی آخری حد ہے۔

'قل اللہ، ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون' یعنی اگر یہ بھول گئے ہیں تو انہیں یہ بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا کیا ہوا ہے اور بتا دینے کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ جس کھیل میں یہ لگے ہوئے ہیں وہ کھیلیں یہاں تک کہ خدا ان کے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ
وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۹۲

'وھذا کتاب انزلناہ مبارک مصدق الذی بین یدیہ' اوپر کا جواب تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان کے قول کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھ کر تھا اب یہ ان کے ذہن کے اندر چھپے ہوئے خیال کو سامنے رکھ کر جواب دیا جا رہا ہے کہ تورات کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل فرمائی؟ اس کے نزول سے کیا کمی پوری ہوئی؟ اوپر والی آیت میں ضمناً یہ اشارہ ہو چکا ہے کہ تورات پر ناز کرنے والے مدعیوں نے تورات کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن وہ ایک ضمنی جواب تھا، اب یہ قرآن کی مستقل حیثیت اور مستقل ضرورت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو ان کے علم میں پہلی بار آئی ہو۔ یہ تو وہ کتاب مبارک ہے جس کی بشارت ابراہیم کو دی گئی تھی اور جس کی پیشین گوئی موسیٰ اور مسیح سب نے کی ہے۔ یہ اسی بشارت ابراہیمی کا ظہور اور انہی پیشینگوئیوں کی تصدیق ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں قرآن کے لیے 'مبارک' اور 'مصدق' کے الفاظ اسی سنہ کو ظاہر کر رہے ہیں جو پچھلے صحیفوں میں اس کی موجود ہے۔ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں حوالے نقل کر آئے ہیں۔ یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ 'مبارک' کا لفظ اس عالمگیر برکت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیمؑ کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے ہوگا۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے۔

"خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا .... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پوری ہوئی۔

'مصدق' کے لفظ پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن اُن پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ تثنیہ باب ۱۸ کے حوالہ سے حضرت موسیٰؑ کی پیشینگوئی اور یوحنا باب ۱۴ کے حوالے سے حضرت عیسیٰ کی پیشینگوئی تفسیر سورہ بقرہ میں نقل ہو چکی ہے۔ ان پیشینگوئیوں سے اس کتاب کی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ ضرورت

بھی واضح ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کا پہلے سے وعدہ فرمایا۔

'ولتنذر ام القری ومن حولھا': اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو پہلے جملہ سے نکلتا ہے۔ یعنی اس کو ہم نے ایک تو اس مقصد سے اتارا کہ یہ اس عالمگیر رحمت و برکت کی بشارت ہو جس کی پیشینگوئی پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ دوسرے اس لیے کہ تم اس کے ذریعے سے ام القریٰ اور اس کے ارد گرد کے لوگوں پر اللہ کی حجت تمام اور انہیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ انہوں نے اس کتاب کو اور تمہاری رسالت کو اگر تسلیم نہ کیا تو وہ اللہ کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ جائیں گے۔

قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے واضح کی گئی ہے اور یہ ضرورت بھی ایک ایسی ضرورت تھی جس کا پورا ہونا ضروری تھا۔ قریش بنی اسمٰعیلؑ کے سربراہ تھے اور ان کی مرکزی آبادی مکہ تھی۔ بنی اسمٰعیلؑ کتاب و نبوت سے نا آشنا امی لوگ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اسمٰعیلؑ کی نسل سے وہ ایک رسول اٹھائے گا جس سے تمام دنیا کی قومیں برکت پائیں گی۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے یہ وعدہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر اس کو قبول کر لیتی ہے تو وہ قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے اور اگر اس کو رد کر دیتی ہے تو چونکہ اس پر اللہ کی حجت پوری ہو چکی ہے وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسمٰعیلؑ کے اندر مبعوث فرمایا۔ رسولوں کے باب میں سنت اللہ یہ بھی ہے کہ وہ جس قوم کے اندر بھیجے جاتے ہیں خاندانی اعتبار سے اس کے اشراف ہی سے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دعوت و انذار میں اول مخاطب قوم کے اعیان و اکابر ہی کو بناتے ہیں اسی وجہ سے آنحضرتؐ کی بعثت مکہ میں ہوئی جو اہل عرب کا دینی و سیاسی مرکز اور قریش کا مستقر تھا۔ اسی اعتبار سے اس کو یہاں ام القریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

'والذین یومنون بالآخرۃ یومنون بہ الآیہ': یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے، رہے وہ لوگ جن کے اندر سرے سے آخرت کا کوئی خوف ہی باقی نہیں رہ گیا ہے ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔ یہ لوگ اسی طرح کی کج بحثیوں میں پڑے رہیں گے جن میں پڑے ہوئے ہیں۔ 'وھم علی صلوتھم یحافظون': یہ خوف آخرت رکھنے والوں کی شناخت بتا دی کہ جن کے اندر آخرت کا خوف موجود ہے وہی ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ کے شروع میں بھی گزر چکا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۗ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۗ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۹۳-۹۴

'ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا' اہل کتاب کے مفسدین کے بعد اب مشرکین مکہ کے لیڈروں کی طرف توجہ فرمائی اور جو ہفوات وہ قرآن کی نسبت بکتے تھے ان کا مختصراً حوالہ دینے کے بعد ان کے انجام کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ ان کی باتیں چونکہ بالکل لایعنی محض ان کے کبر و غرور کا مظاہرہ تھیں اس وجہ سے ان باتوں کے جواب کے بجائے اصل ضرب ان کے کبر و غرور پر لگائی۔ ان کے ذکر کا آغاز ان کے سب سے بڑے ظلم یعنی شرک کے ذکر سے فرمایا۔ شرک کی نسبت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ارتکاب کر کے انسان اپنے رب کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی سب سے بڑی توہین کرتا ہے، اس وجہ سے یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ پھر مزید یہ کہ اللہ کے اوپر یہ جھوٹا افترا ہے اس لیے کہ مشرک محض اپنے جی سے کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا شریک قرار دیا ہے حالانکہ اس دعوے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

'او قال اوحی الی ولم یوح الیہ شیٔ ومن قال سانزل مثل ما انزل اللہ' اس افترا پر مزید افترا یہ کہ قریش کے بعض اکابر یہ کہتے کہ جس وحی کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دعویٰ کرتے ہیں اس طرح کی وحی تو ان پر بھی آتی ہے اگر وہ چاہیں تو اسی طرح کا کلام وہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود محض اس اثر کو اپنے عوام کے دلوں سے زائل کرنا ہوتا جو اُن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے پڑتا کہ جو کلام آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی وحی ہے جو وہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعے سے آپ پر نازل فرماتا ہے۔ ان مفتریوں نے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا

کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تجربہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو ہوتا ہو، اس طرح کی وحی ہم پر بھی آتی ہے ہم بھی چاہیں تو اپنی وحی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم چونکہ اس طرح کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس وجہ سے کوئی دعوے کر نہیں اٹھے۔ دوسری جگہ ان کی یہی بات یوں نقل ہوئی ہے:- وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ' ۳۱- انفال (اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، کہتے ہیں بس کرو، سن لیا، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اسی طرح کا کلام پیش کر دیتے، یہ ہے کیا، یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے) یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام ان کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اس قسم کی نمائشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے سکتی ہے۔ بالآخر ان زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔

'ولو تری اذ الظالمون فی غمرات الموت الایہ' شرط کا جواب، اس طرح کے مواقع میں حذف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے حذف سے اس کی ہولناکی کی جو تصویر چشم تصور کے سامنے آتی ہے وہ اس کے اظہار کی صورت میں نہیں آ سکتی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کے متعلق یہ باتیں قریش کے متمردین کہتے تھے۔ فرمایا کہ آج یہ لوگ اللہ کی کتاب کے باب میں اس رعونت کا اظہار کر رہے ہیں لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ موت کی سکرات میں گرفتار ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر ان سے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالہ کرو، اب وقت آگیا ہے کہ تم کو تمہارے افترا اور آیات الٰہی سے تمہارے متکبرانہ اعراض کی پاداش میں تم کو ذلت کا عذاب چکھایا جائے۔ ذلت کا عذاب اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے مقابل میں رعونت اور تکبر کا اظہار کیا۔ 'تقولون علی اللہ غیر الحق' سے ان کے قول 'اوحی الی' اور ان کے شرک کی طرف اشارہ ہے۔ 'کنتم عن ایاتہ تستکبرون' میں استکبار کا لفظ اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے اس وجہ سے یہاں اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ کی کتاب سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ سخت اعراض وہ ہے جو غرور اور رعونت کے سبب سے ہو۔ یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی خاص وراثت ہے۔ قریش کے لیڈروں پر یہ بات بڑی شاق تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی نعمت

یا عزت ان کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو اپنا رسول بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی سردار کو بناتا۔ اسی غرور کا مظاہرہ ان کی ان باتوں سے بھی ہوا جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔

'ولقد جئتمونا فرادی' الآیۃ کے یہاں غائب کو حاضر کے اسلوب میں کر دیا ہے تاکہ 'فرادی' میں ان کے جس انجام بد کا حوالہ دیا ہے اس کی ہولناکی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ گویا قیامت آگئی اور ان سے خطاب کرکے کہا جا رہا ہے کہ دیکھو جس طرح تم دنیا میں بے سروسامان گئے تھے اسی طرح بے سروسامان آج ہمارے حضور میں حاضر ہو گئے، نہ تمہارے ساتھ وہ مال و متاع اور وہ لاؤ لشکر ہے جس کے بل پر تم اتراتے تھے اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہیں جن کو تم ہمارا ساجھی گمان کیے بیٹھے تھے اور جن سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے مقابل میں تمہارے کام آئیں گے۔ 'خلقناکم اول مرۃ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک مضغۂ گوشت اور عملاً تمام صلاحیتوں سے خالی ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی تمام صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور اس کو ان وسائل و ذرائع اور ان احوال و املاک کا مالک بناتا ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ خدا کی نعمتیں پا کر وہ اس کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا اکڑنے والا اور اترانے والا بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے کہ وہ اسی طرح خالی ہاتھ خدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے اور ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جاتی جن کے بل پر وہ یہاں اکڑتا تھا۔ 'لقد تقطع بینکم' میں فاعل میرے نزدیک حذف ہے یعنی 'لقد تقطع الحبل بینکم'۔ 'وضل عنکم ما کنتم تزعمون' میں اشارہ شرکاء و شفعاء کی طرف ہے۔ یعنی یہ سب ہوا ہو جائیں گے۔

۱۵- آگے کا مضمون آیات ۹۵-۱۰۸

اوپر کا مجموعۂ آیات توحید کے مضمون پر ختم ہوا تھا۔ اسی مضمون کے تعلق سے آگے توحید کے دلائل کی مزید وضاحت ہوئی۔ یہ دلائل توحید کے آفاقی دلائل ہیں جو بیان اس طرح ہوئے ہیں کہ ان سے معاد اور رسالت پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ گویا وہ پورا مضمون ایک نئے اسلوب سے سامنے آگیا ہے جو اس سورہ میں زیر بحث ہے۔ نیز کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے اس صحیح نقطۂ نظر کی طرف بھی اس سے رہنمائی ہو رہی ہے جو اوپر حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں واضح ہوا ہے۔ پھر اسی تعلق سے قریش کو مخاطب کرکے ان کو مناسب حال تنبیہ کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے آپ کو تسلی دی گئی ہے، مسلمانوں کو مخاطب کرکے مقتضائے وقت کے مناسب

ہدایات دی گئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے سورہ اسی انداز پر چل رہی ہے۔ مرکزی مضمون، توحید، معاد، رسالت، بار بار مختلف اسلوبوں سے سامنے آتا ہے اور بار بار مخاطبین کے اعتراضات اور ان کے رویے کے تعلق سے کلام تردید یا توضیح یا تسکین یا موعظت کی طرف مڑ جاتا ہے لیکن سررشتۂ کلام کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے:

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ ۖ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ۹۵ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ
سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۹۶
وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَ
الْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۹۷ وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ
كُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۹۸ وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِجُ
مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ
وَجَنّٰتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ۗ انْظُرُوا إِلٰى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكُمْ
لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۹۹ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ
وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَصِفُونَ ۱۰۰ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَنّٰى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَ
لَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ ۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۱۰۱
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۖ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۱۰۲ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ
الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۱۰۳ قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ
رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا
عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۱۰۴ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ
وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۱۰۵ اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ

لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝١٠٦ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ أَشْرَكُوا ۗ
وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۝١٠٧ وَلَا
تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ
عِلْمٍ ۗ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِم
مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝١٠٨

ترجمہ

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز وعلیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں۔ اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے پھر ہر ایک کے لیے ایک مستقر اور ایک مدفن ہے، ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں۔ اور کھجور کے گابھے سے جھکتے ہوئے گچھے۔ اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہم ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۹۵-۹۹

اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں

لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ ۱۰۰-۱۰۳

اب تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت بخش آیتیں آ چکی ہیں تو جو بصیرت سے کام لے گا اپنے ہی کو نفع پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تم پر کوئی نگران مقرر نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے۔ اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے۔ اور نہ تم ان کے ضامن ہو۔ ۱۰۶-۱۰۷

اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔ پھر ان کے رب ہی کی طرف ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انہیں اس سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۰۸

ہم سے طلب فرمائیے

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

• اسلامی قانون کی تدوین
صفحات ۱۶۰ قیمت ۳ روپے
سستا ایڈیشن ۲ روپے

• تزکیۂ نفس
صفحات : ۴۴۳
قیمت : ۶ روپے

• تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ
بڑا سائز۔ صفحات ۳۶ - ہدیہ: ۷۵ پیسے

دار اشاعت الاسلامیہ۔ کوثر روڈ، اسلام پورہ لاہور ۱

ہم سے طلب فرمایئے

تصانیف مولانا فراہی رح

تفاسیر

تکمیل فی اصول التاویل (عربی) سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۸۲ ، طباعت ٹائپ :	قیمت ۴ء۰۰ روپے
دلائل النظام (عربی) سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۳۲ طباعت ٹائپ ، کاغذ عمدہ سفید :	قیمت ۵ء۰۰ "
مقدمہ تفسیر نظام القرآن (اردو ترجمہ)	" ۰ء۵۰ "
تفسیر بسم اللہ و سورہ فاتحہ	" ۰ء۴۵ "
" سورۃ قیامہ	" ۰ء۶۰ "
" والشمس	" ۰ء۵۰ "
" فیل	" ۱ء۰۰ "
" ذاریات	" ۱ء۳۰ "
" مرسلات	" ۰ء۶۰ "
" والتین	" ۰ء۶۰ "
" کوثر	" ۱ء۱۰ "
" لہب	" ۰ء۶۰ "
" تحریم	" ۰ء۶۰ "
" عبس	" ۰ء۶۰ "
" والعصر	" ۰ء۴۰ "
" کافرون	" ۰ء۴۵ "
" اخلاص	" ۰ء۴۵ "
اقسام القرآن	" ۱ء۳۰ "
ذبیح کون ہے؟	" ۱ء۶۰ "

لغت و ادب

اسباق النحو
حصہ اول : ۱ء۵۰ روپے
حصہ دوم ۱ء۱۵ "

تحفۃ الاعراب
قیمت ۰ء۳۵ "

امثال آصف الحکیم
قیمت : ۱ء۳۵ روپے

جمہرۃ البلاغہ
قیمت : ۱ء۵۰ روپے

مفردات القرآن
قیمت : ۱ء۴۰ روپے

دیوان عربی
قیمت : ۱ء۵۰ "

نوائے پہلوی
(دیوان فارسی)
قیمت : ۲ء۰۰ "

دارالاشاعت الاسلامیہ اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور — فون نمبر ۶۹۵۲۲

افاداتِ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی

محمد مقبول عالم بی اے ، جائنٹ سکرٹری ، ولی اللہ سوسائٹی پاکستان لاہور

مدنیتِ فاسدہ

ذیل میں ہم حکیم الامت امام ولی اللہ دہلوی کے وہ حکیمانہ اور خیال افروز بیانات پیش کرتے ہیں جو انہوں نے شہری زندگی کے فساد کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ ۱۰۵ / ۱۰۶ (طبع مصری) پر فرماتے ہیں کہ :-

"واضح رہے کہ جب کسی شہر میں باشندوں کی تعداد مثلاً دس ہزار ہو جائے تو سیاست مدینہ ان کے پیشوں سے بحث شروع کر دیتی ہے۔ کیونکہ اگر اس آبادی کا بیشتر حصہ صنعت و حرفت اور نوکری چاکری میں لگ جائے اور مویشی کی پرورش اور زراعت میں مشغول لوگوں کی تعداد کم رہ جائے تو اس سوسائٹی کی دنیاوی حالت تباہ ہو جائے گی۔ اور اگر لوگ شراب کشی اور بت سازی کا پیشہ اختیار کریں تو لوگ خواہ مخواہ ان کا استعمال شروع کر دیں گے اور یہ امر ان کی دینی زندگی کی بربادی کا موجب ہوگا۔ پس اگر پیشے اور پیشہ ور ولی حکمت کے مطابق تقسیم ہو جائیں اور پیشہ وروں کو قبیح پیشوں سے روک دیا جائے، تو سوسائٹی کی حالت اچھی ہو جائے گی۔

عیش پسندی کی ترویج

ایسے ہی شہروں کی بربادی کے اسباب میں سے یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ ارتفاقات ضروریہ سے آگے بڑھ کر جن پر تمام دنیا کی اقوام کا اتفاق ہو چکا ہے، عمدہ زیورات، نفیس لباس، شاندار عمارات، لذیذ طعام اور عورتوں کے حسن وغیرہ کے پیچھے پڑ جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ وہی پیشے اختیار کریں گے جو امراء کی خواہشیں پوری کر سکیں۔ مثلاً لوگ دوشیزہ لڑکیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دینے لگیں گے اور بعض انہیں بدن کی ایسی حرکات سکھانے لگیں گے جن کے دیکھنے سے دیکھنے والے کو لطف و لذت محسوس ہو۔ بعض لوگ کپڑوں کے رنگنے اور ان پر حیوانات اور مناظر طبعی کی

تصویریں بنانے اور عجیب و غریب نقاشی کرنے میں تخصیص پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ بعض لوگ سونے، چاندی اور بیش قیمت جواہرات کی صنعتیں اختیار کریں گے۔ بعض لوگ بلند اور شاندار مکانات، کوٹھیاں اور محلات تعمیر کرنے کا پیشہ اختیار کریں گے اور بعض ان میں طرح طرح کی نقاشی میں کمال پیدا کر لیں گے۔

نتائج جب سوسائٹی کا بیشتر حصہ ان پیشوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو زراعت اور تجارت کے بنیادی پیشے یونہی رہ جاتے ہیں اور جب شہر کے بڑے بڑے لوگ اپنا مال و دولت ان عیاشیوں میں صرف کرنے لگتے ہیں تو سوسائٹی کی اصل ضرورتیں رہ جاتی ہیں۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ضروری اور بنیادی پیشوں مثلاً زراعت، تجارت اور صناعت میں مصروف ہوتے ہیں وہ تنگ حال ہو جاتے ہیں اور ان پر ٹیکسوں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔

شہر کو جو یہ بیماری لگتی ہے تو اس کا اثر اس کے تمام اعضا تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سارا شہر بیمار پڑ جاتا ہے اور یہ مرض اس کے بدن میں اس طرح پھیل جاتا ہے جس طرح کتے کے کاٹے ہوئے مریض میں کتے کا زہر۔

یہ تو دنیاوی نقصان کا بیان تھا۔ باقی رہا وہ نقصان جو انسان کو اخروی کمال حاصل نہ ہونے سے پہنچتا ہے تو وہ ناقابل بیان ہے۔

ایران کی مثال عجمی شہروں میں یہی مرض پھیل چکا تھا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں ڈالا کہ اس کا علاج (جراح کے طریق پر فاسد) مادہ کاٹ پھینکنے سے کرے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو غور سے دیکھا جن میں یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں یا جو ان خرابیوں کے پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہیں۔ مثلاً گانے والی لڑکیاں، ریشم، سونے کے زیورات یا برتن اور کھوٹا سونا زیادہ تعداد میں دے کر کھرا سونا خریدنا تاکہ صاف کرکے اعلیٰ درجے کا سونا حاصل کیا جائے وغیرہ وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب باتیں منع فرما دیں۔"

پھر آپ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول کے صفحات ۱۰۵ و ۱۰۶ پر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس دردناک حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ:-

"واضح رہے کہ جب ایرانیوں اور رومیوں کو اپنی سلطنتیں چلاتے صدیاں گذر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی کی اصل بنا لیا اور یہ بھلا بیٹھے کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہو کر کسی اعلیٰ طاقت کے آگے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے اور ان پر ان کے شیطانی نفس غالب آ گئے تو انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ عیش پرستی میں گہری سے گہری باتیں سوچیں اور پھر عیاشی کی زندگی پر فخر کریں۔ چنانچہ دنیا بھر سے ایسے

ماہرین ان کے دربار میں آنے جانے لگے جو ان کے لئے عیاشی کی زندگی بسر کرنے کے نہایت پُرتکلف طریقے ایجاد کرتے تھے وہ ایسا ہی کرتے رہے اور ایک دوسرے پر گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنی عیاشیوں اور عیش پرستیوں پر فخر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان امراء اور سرمایہ داروں کا یہ حال ہو گیا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم مالیت کا پٹکا یا ٹوپی ہوتی تھی اُسے بخیلی کا عار دلایا جاتا تھا ایسے ہی انہوں نے عالیشان سربفلک محل، آبزن اور حمام، بے نظیر پائیں باغ، سواری کے غارشی جانور، خوبصورت غلام اور حسین باندیاں اپنی زندگی کے لئے لازمی قرار دے لیں اور زندگی کی ضرورت اصل اسے ہی سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں ہوں جن میں طرح طرح کے کھانے وسیع دسترخوان پر سجے ہوں اور خود بالباس فاخرہ پہنے بیٹھے ہوں۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں دہلی کی حالت غرض ملوک ایران و روم کی داستان یہاں تک کہاں بیان کی جائے؟ تم اپنے زمانے کے بادشاہان دہلی کی جو حالت دیکھتے ہو وہی ان ملوک ایران و روم کی حالت کے قیاس کرنے کے لئے کافی ہے[1]

ان ملوک و امراء کی زندگی کے یہ طور طریقے رفتہ رفتہ عوام کے نظام معاشی کے اصل اصول بن گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سوسائٹی میں سے ان خرابیوں کا استیصال ناممکن ہو گیا اور اس کی بس ایک صورت باقی رہ گئی کہ ممکن ہو تو یہ چیزیں لوگوں کے دلوں میں سے کھرچ کھرچ کر نکال ڈالی جائیں۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی کے سبب سے خطرناک امراض پیدا ہو گئے جو معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو گئے اور یہ حالت ایسی ہمہ گیر ہو گئی کہ وبا کی طرح ساری مملکت میں سرایت کر گئی۔ اس سے نہ شہری بچا نہ دیہاتی، نہ امیر محفوظ رہا نہ غریب۔ یہاں تک کہ ہر شخص اس کی خرابیاں دیکھ کر مگر علاج نہ پا کر عاجز آ گیا اور بے حد و نہایت مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا۔

ٹیکسوں کی بھرمار اس ہمہ گیر اقتصادی مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامان عیش و عشرت کثیر مال و دولت صرف کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا اور مال خطیر کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے کے لگے ہوئے ٹیکس بڑھانے کے سوا حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر یہ ٹیکس لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کر کے حاصل کئے جاتے تھے اور اگر وہ ٹیکس دینے سے انکار کرتے تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی اور گرفتار کر کے طرح طرح سے عذاب دیا جاتا تھا۔ اگر وہ کفایت شعاری کے ساتھ ٹیکس

[1] ابھی پاکستان کے لئے اس قدر دُور جانے کی بھی کوئی حاجت نہیں۔ لاہور میں گلبرگ اور کراچی میں کلفٹن یا ہاؤسنگ سوسائٹیز کے "شرفاء" کے یہاں جو رہن سہن اس وقت رائج ہے وہ ان معاملات میں کسی سے پیچھے نہیں۔ (مدیر)

ادا کرتے رہتے تو ان سے ٹیکس وصول کرتے کرتے ان کو گدھوں اور بیلوں کے درجے پر پہنچا دیا جاتا جن سے آب پاشی، فصل کاٹنے اور گاہنے کا کام لیا جاتا ہے اور جنہیں صرف اس لئے زندہ رکھا جاتا ہے کہ ان سے کام لیا جاتا ہے۔

عوام کی حالت اس تنگ حالی اور بے سروسامانی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کمانے کے سوا اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ سعادت اخروی کے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ اور رفتہ رفتہ ان کے اندر غور و فکر کا مادہ بھی فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو مادی اسباب کے حصول سے اوپر نظر اٹھا کر غیر مادی کائنات کے اصولِ حیات کے مطابق بھی کوئی حرکت کر سکے۔

انسانی معاشرت پر خطرناک اثر اس فاسد نظامِ معیشت میں سامانِ عیاشی جہاں مال خرچ کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا وہاں اس کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کو ان عیاشیوں کے لئے طرح طرح کے کھانے اور عیاشی میں مدد دینے والی دوائیں تیار کرنے اور لباس فاخرہ ایجاد کرنے اور عالیشان محلات بنانے کے پیشے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی وجہ سے وہ پیشے رہ جاتے ہیں جن پر انسانی معاشرے کا مدار ہے۔

یہ مصیبت صرف بادشاہوں اور امیروں ہی کے طبقے تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ رفتہ رفتہ عوام بھی جن کا واسطہ ان امیروں سے پڑتا ہے، اپنے آقاؤں کی ریس کرنے لگ جاتے ہیں ورنہ انہیں ان آقاؤں کی نگاہوں میں عزت و احترام حاصل نہیں ہوتا اور نہ ان کے درباروں میں قدر ہوتی ہے۔

بے کاری کی مصیبت اس طرح رفتہ رفتہ امیر و غریب سب لوگوں کا بار کفالت بادشاہوں پر آ پڑتا ہے اور وہ ان سے روزینہ طلب کرتے ہیں۔ مثلاً ایک طبقہ جنگ کے بغیر جنگجو باپ دادا کے نام سے وظیفہ خوری کرتا ہے۔ دوسرا طبقہ مدبرینِ مملکت کے نام سے پرورش پانے لگتا ہے حالانکہ وہ خود اس سلسلے میں کوئی کام نہیں کرتے صرف اپنے باپ دادا کے نام کو کھاتے ہیں۔ ایک گروہ بادشاہوں اور امیروں کی مدح خوانی کر کے ان کے خوانِ کرم سے زلہ ربائی کرتا ہے۔ کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے بہانے مال استحصال کرتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے یہاں تک کہ ایک دوسرے کے لئے تنگ حالی کا موجب بن جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے بہترین مفید ذرائع کے بجائے ان لوگوں کا ذریعہ معاش امراء کی مصاحبت اور ندیمی، چرب زبانی اور چاپلوسی رہ جاتا ہے اور وہ اپنے اوقاتِ عزیزہ اپنی لغویات

میں ضائع کرنے لگ جاتے ہیں۔

اخلاقی بربادی جب لوگ ہر وقت اس قسم کی لغو باتوں میں مشغول رہنے لگتے ہیں تو ان کی ذہنیت خراب ہو جاتی ہے اور کمینہ خصلتیں ان کے نفوس میں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ اخلاق فاضلہ سے عاری رہ جاتے ہیں۔

ایک مثال اس مرض کی حقیقت معلوم کرنی ہو تو اس قوم کی حالت پر غور کرو جس نے ابھی تمدن و سیاست کے میدان میں زیادہ ترقی نہیں کی۔ یہ وہ قوم ہے جس کے افراد ابھی کھانے پینے اور کپڑے لتے کے تکلفات میں نہیں پڑے۔ ایسی قوم کا ہر فرد خود مختارانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ کمرشکن سرکاری ٹیکسوں کے بوجھ سے آزاد ہے۔ ایسے لوگ دینی اور ملی امور پر غور کرنے کے لئے کافی فرصت پاتے ہیں۔ اس کے بعد اس قوم کی حالت پر غور کرو جب اس میں بین الاقوامی سیاسی مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے اب وہ رعیت کو غلام بنا لیتے ہیں اور اس پر پورا پورا تسلط جما لیتے ہیں۔

عیاشانہ زندگی کا انجام: انقلاب غرض جب ایران اور روم کی سوسائٹی اس حالت کو پہنچ گئی۔ اور عوام کی مصیبت بڑھتے بڑھتے حد سے گزر گئی اور مرض لا علاج ہو گیا تو حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے ناراضی کا اظہار کیا اور مقرب فرشتوں نے بھی اسے ملعون قرار دیا۔ اب حکمت خداوندی کا تقاضا یہ ہوا کہ اس مرض کے علاج کا واحد طریق یہ ہے کہ فاسد مادہ نکال کر کاٹ پھینکا جائے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے اس نبی امی کو مبعوث فرمایا گیا جو کبھی ایرانیوں یا رومیوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہا تھا۔ اور نہ جس نے کبھی ان کے رسم و رواج اختیار کئے تھے۔ چنانچہ اسے اپنے نزدیک عادات صالحہ و غیر صالحہ کی جانچ کا معیار بنایا اور اس کی زبان سے ایرانیوں وغیرہ کی عادات، دنیا کی زندگی میں انہماک اور اس پر اطمینان سے بیٹھ رہنے کی سخت مذمت کرائی اور ایرانیوں کی رسم و رواج کے اصول کو جن پر وہ فخر کرتے تھے حرام قرار دیا مثلاً ابریشم خالص اور عوامی ریشمی وغیرہ کے کپڑے پہننا، سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا، ان کھرے سونے کے زیورات بنانا، تصویروں والے کپڑے پہننا اور مکانوں کو نقاشی سے سجانا وغیرہ۔ نیز حکمتِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ذریعے سے ان کے نظامِ فاسد کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی قیادت کے ذریعے سے ان کی بین الاقوامی لیڈرشپ مٹا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کسریٰ رہا نہ قیصر اور ان کے ساتھ کسرویت اور قیصریت کا بت بھی ٹوٹ گیا۔

یہاں یہ ضرور ملحوظ رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ انسان دنیا ترک کر دے اور اپنے تمدن کو ترقی نہ دے بلکہ اللہ کا مقصد اس میں توازن پیدا کرنا ہے تاکہ معاشرے میں نہ

رفاہیت بالغہ رہے اور نہ رفاہیت ناقصہ بلکہ سب رفاہیت متوسطہ میں زندگی بسر کریں اور اپنی اور دوسروں کی دنیوی اور اخروی بھلائی کے کام کرسکیں۔ چنانچہ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل صفحہ ۱۰۴ پر فرماتے ہیں :۔

"واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ نہیں ہے کہ تمدن کی دوسری اور تیسری منزل یعنی شہری اور قومی منزل کو ترک کر دیا جائے اور نہ انبیا علیہم السلام میں سے کسی نے اس کا حکم دیا ہے اور یہ امر قطعاً ایسا نہیں ہے جیسا ان لوگوں نے سمجھا۔ جو پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلے اور لوگوں کے ساتھ ان کے دُکھ اور سُکھ میں بالکل شراکت چھوڑ بیٹھے اور وحشی جانوروں کی طرح ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی تردید فرمائی جنہوں نے ترکِ دنیا کا ارادہ کیا اور فرمایا " میں رہبانیت لے کر مبعوث نہیں ہوا بلکہ ایک آسان دینِ حنیفی لے کر مبعوث ہوا ہوں "۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے تمدنی زندگی میں اعتدال کا حکم دیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ اسے عیاشی کی حد تک پہنچا دیں جیسے کہ شاہانِ عجم تھے۔ اور نہ اُسے آبادیوں سے دور پہاڑی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے درجے تک پہنچا دیں جو وحشیوں جیسے ہوتے ہیں۔

اس جگہ دو نظریے قائم کئے گئے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ ایک یہ کہ آسودہ حالی اچھی چیز ہے اس سے انسان کے مزاج کی اصلاح ہوتی ہے، اخلاق میں استقامت پیدا ہوتی ہے، علوم و فنون کی اشاعت ہوتی ہے جن کی وجہ سے آدمی دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے کیونکہ وحشت و جہالت اور عجز و پست ہمتی وغیرہ نظام تمدن کی خرابی ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آسودہ حالی بُری چیز ہے اس سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، عالم غیب کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور حیاتِ اخروی سے غفلت پیدا ہوتی ہے۔

ان دونوں کے درمیان پسندیدہ طریقہ توسط اور میانہ روی کا ہے۔ کہ نظامِ تمدن کو باقی رکھا جائے مگر اس کے ساتھ اذکار و اوراد اور آداب و اخلاق اور عالمِ جبروت کی طرف توجہ کرنے کے مواقع مہیا کرائے جائیں"

اہلِ پاکستان کو چاہیئے کہ پاکستانی معاشرہ کی تشکیل ان افکار کی روشنی میں کریں اور اس طرح ایک خوشحال رفاہی مملکت کی بنیاد رکھیں۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ عیاشی کے سامان نہ تو درآمد کئے جائیں اور نہ ملک کے اندر تیار کرنے اور فروخت کرنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ نہ یہ چیزیں موجود ہوں اور نہ کوئی ان کی خواہش کرے۔ مکانوں کی سادہ قسمیں تجویز کی جائیں اور انہی کے مطابق مکان تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ نہ یہ کہ عالیشان محلات بنا کر ملک کی دولت کو برباد کیا جائے۔ ایسے ہی زندگی کی دوسری ضروریات متعلقہ خوراک، لباس، سواری، آرائش و زیبائش

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں شخصی آزادی اور درخواست، فریاد اور اعتراض کا حق

۱۔ شخصی آزادی

ہر شخص کی شخصی آزادی (PERSONAL LIBERTY) بالکل محفوظ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبورِ محض نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ ایک خاص دائرہ کے اندر اس کو اختیار بھی بخشا ہے اور اسی اختیار ہی کی بناء پر اس کو دنیا میں اپنے امر و نہی کا مکلّف اور آخرت میں جزا و سزا کا سزاوار بنایا ہے۔ اسی طرح اس نے انسانوں کے لئے جو اجتماعی نظام پسند فرمایا ہے اس میں فرد کو جماعت کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں ایک خاص حد تک اس کی انفرادی آزادی بھی محفوظ رکھی ہے۔ اور اس آزادی ہی کے صحیح یا غلط استعمال پر اس کی انفرادی شخصیت کے کمال و زوال اور آخرت میں اس کی فلاح و خسران کو منحصر کیا ہے اس وجہ سے یہ عین منشاء الٰہی ہے کہ ہر شخص کی انفرادی آزادی اس وقت تک محفوظ رکھی جائے جب تک وہ اپنی اس آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے اور جماعت کے کسی واجبی مفاد کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے استعمال نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے بغیر اگر حکومت کسی شہری کی انفرادی آزادی میں خلل انداز ہوتی ہے تو وہ نہ صرف اس کی انفرادی آزادی کے قتل کی مجرم بنتی ہے بلکہ اس کی آخرت کی فلاح و سعادت میں مزاحمت پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیتی ہے۔ اس وجہ سے اسلامی نظام میں جب تک کسی شخص کی بابت یہ بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جائے کہ اس کی آزادی دوسروں کی آزادی اور ان کے حقوق کے لئے خطرہ ہے اس وقت تک نہ تو اس کی آزادی پر کوئی پابندی لگائی جا سکتی ہے اور نہ کسی اور نوعیت سے اس میں مداخلت کی جا سکتی ہے۔ اسلام اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ محض شبہات و اوہام یا بے بنیاد الزامات کی بنا پر کسی شخص کو اس کے اس سب سے بڑے فطری حق سے محروم کر دیا جائے جس کی حفاظت کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نام سے اس کو گارنٹی دی گئی ہے۔ انفرادی مصلحت سے قطع نظر تمدنی و اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی اسلام شبہات کی بنا پر کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم کر دینا بھی کسی حال میں ریاست کے

مفاد کے لئے ضروری ہو سکتا ہے۔ اسلام اس کے برعکس اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اگر کوئی حکومت محض جھوٹی سچی رپورٹوں اور افواہی قسم کی خبروں کی بنا پر اپنے شہریوں کی آزادی پر حملہ کرنے لگ جاتی ہے تو وہ لوگوں کی تمدنی و اجتماعی صلاحیتوں کو تعمیر کے بجائے تخریب کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور پھر اس کے لازمی نتیجے کے طور پر پورے ملک کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سیاسی و اجتماعی نکتہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

عن مقدام بن معدیکرب وابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم (ابو داؤد۔ کتاب الادب)

مقدام بن معدیکرب اور ابو امامہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امیر (حکومت) جب لوگوں کے اندر تہمت کے بہانے ڈھونڈنے لگ جاتا ہے تو پھر ان کو بگاڑ کے رکھ دیتا ہے[1]۔

اسلام شہریوں کے اندر اعلیٰ شہری کردار پیدا کرنے کے لئے اس امر کو ضروری قرار دیتا ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں شک و شبہ کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے حسن ظن و اعتماد کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اسباب سزا دینے کے نہیں بلکہ برأت کے ڈھونڈھے جائیں۔ ایک شہری کو معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اسلام کے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ اس کو سزا دینے میں غلطی کی جائے۔

ادرؤا الحدود عن المسلمین ما

جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں (شہریوں) کو سزا

---

[1] اس حدیث میں ایک نہایت اہم مضمون بیان ہوا ہے جس سے سرسری طور پر گزر جانا چاہئے۔ بگاڑ کر رکھ دینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ اس طرح کی حرکتوں سے پبلک اور حکومت کے تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دلی کھنچاؤ ہے اور دونوں کے باہمی اعتماد میں فرق آجاتا ہے بلکہ اس طرزِ عمل سے آگے چل کر خود قومی استحکام کو بھی سخت دھکا لگتا ہے۔ جب حکومت اور اس کے زیر اثر لوگوں کی طرف سے ہر وقت یہ چرچا ہو کہ ملک میں غدار چھپے ہوئے ہیں، غیر ملکی ایجنٹ آئے ہوئے ہیں، تخریبی کارروائیاں ہو رہی ہیں، انتشار پھیلانے والے موجود ہیں لیکن نہ تو ان جرائم کی کوئی معین تعریف ہو، نہ ان کی کوئی قانونی تعریف کی جائے اور نہ تعیین کے ساتھ کسی پر کوئی الزام لگا کر اس کا ثبوت بہم پہنچایا جائے تو رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کا ہر شخص دوسرے شخص سے بدگمان ہو جائے گا اور کسی حقیقی خطرہ کے موقع پر ملک کے لوگ ایک بنیان مرصوص بن کر کھڑے نہ ہو سکیں گے کیونکہ ہر ایک کو دوسرے پر شبہ ہوگا کہ نہ معلوم یہ غدار یا غیر ملکی ایجنٹ یا تخریبی کارروائیاں کرنے والا ہی نہ ہو۔ پس حضور کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے شہریوں پر مبہم الزام تراشیوں کو تو کھیل نہ بنایا جائے اور نہ سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا جائے یا تو اپنے الزامات کی ایک قانونی متعین کردہ تعیین کے ساتھ کسی خاص شخص پر کوئی خاص الزام لگا کر عدالت میں اسے ثابت کرو اور پھر اسے عبرتناک سزا دو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی زبان بند رکھو۔

استطعتم فان کان لہ مخرج فخلوا سبیلہ، فان الامام ان یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبۃ (ترمذی)

سے بچاؤ۔ کوئی گنجائش بھی اگر نکلتی ہو تو ان کو چھوڑ دو۔ یہ بات کہ امام (حکومت) کسی شخص کو چھوڑ دینے میں غلطی کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

ادفعوا الحدود ما وجدتم لہا مدفعاً (ابن ماجہ)

جب تک بچنے کی کوئی راہ مل رہی ہو اس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔

پھر اسلام کی رو سے چونکہ وجود حکومت کوئی مقصود بالذات شے نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک ذریعہ ہے اس بات کا کہ شہریوں کو اپنے عمل کی وہ آزادی بہم پہنچائی جائے جو اسلام نے افراد معاشرہ کو بخشی ہے تاکہ آزمائش کی وہ غرض کما حقہ پوری ہو سکے جس کی خاطر ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر پیدا کیا ہے۔ اس وجہ سے اسلام کسی غیر معمولی حالت (STATE OF EMERGENCY) میں بھی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انصاف کی شرطیں پوری کئے بغیر کسی شہری کی آزادی کو سلب یا محدود کر دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی اور خلافت راشدہ کی تاریخ میں ہمیں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جو اس امر کی ناقابل تردید شہادت ہیں کہ حالات خواہ معمولی ہوں یا غیر معمولی کسی حالت میں بھی اسلامی ریاست میں کسی شہری پر باقاعدہ مقدمہ چلائے اور اس کا جرم ثابت کئے بغیر اس کو گرفتار نہیں رکھا جا سکتا۔ ان میں سے بعض واقعات ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ پہلے ہم واقعات نقل کریں گے، اس کے بعد ان حالات پر روشنی ڈالیں گے جن میں یہ واقعات پیش آتے ہیں اور ساتھ ہی ان احکام کی طرف اشارہ کریں گے جو ان سے نکلتے ہیں۔

(۱) عن بھز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ (ای جدہ) قام الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یخطب، فقال جیرانی بما اخذوا؟ فاعرض عنہ مرتین، ثم ذکر شیئاً فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خلوا لہ جیرانہ (ابو داؤد، کتاب القضاء)

بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے دادا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت اس وقت خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (خطبہ کی وجہ [illegible]) لیکن انہوں (سائل) نے پھر کچھ کہا تو آپ نے حکم دیا کہ ان کے پڑوسیوں کو رہا کر دو۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا۔ عمرو بن عاصؓ اس کے فاتح تھے اور انہیں کو اس کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ ایک روز ان کے صاحبزادے محمد بن عمرو نے ایک مصری کے کوڑے مار دیئے عمرو بن عاصؓ نے اس ڈر سے کہ یہ خبر اگر مصریوں میں پھیلی تو کہیں کوئی فتنہ نہ برپا ہو جائے اس مصری کو قید کر دیا۔ لیکن وہ جیل سے بھاگ نکلا اور سیدھا حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سنی اور فوراً عمرو بن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو طلبی کا حکم بھیجا۔ جب وہ دونوں حضرات آگئے تو سارے حالات کی تحقیق کے بعد آپ نے بھری مجلس میں مصری کو حکم دیا کہ محمد بن عمرو (گورنر مصر کے صاحبزادے) کے کوڑے لگاتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ بیٹے کو اس ظلم کی جرأت باپ ہی کے بل بوتے پر ہوئی اس لئے اب تو ذرا ان گورنر صاحب کی بھی خبر لے۔ مصری نے کہا کہ امیر المومنین۔ جس نے مجھ پر ظلم کیا تھا میں نے اس سے بدلہ لے لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس کا تجھے اختیار ہے۔ تو معاف کرتا ہے تو کر دے ورنہ میری طرف سے ان سے بھی بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ پھر عمرو بن عاص سے مخاطب ہو کر فرمایا :۔

ایا عمروا متی تعبّد تم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً ؟

اے عمرو ! تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنایا، ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔[1]

(۳) عن ربیعۃ بن عبد الرحمٰن انہ قال قدم علی عمر بن الخطاب رجل من اھل العراق، فقال جئتک لامر مالہ راس ولا ذنب۔ قال عمر ما ھو؟ قال شھادۃ الزور، ظھرت من ارضنا فقال عمر اوقد کان ذالک قال نعم۔ فقال عمر واللّٰہ۔ لا یسر رجل فی الاسلام بغیر العدل

(مؤطا باب الشرط الشاہد)

ربیعہ بن عبد الرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس اہل العراق میں سے ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ امیر المومنین میں ایک ایسے معاملہ کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا کہ جھوٹی شہادت کا فتنہ ہمارے ملک میں پھوٹ پڑا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اچھا، یہ چیز شروع ہو گئی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا تم پریشان نہ ہو۔ خدا کی قسم، اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

اب ان حالات پر غور کیجئے جن میں یہ واقعات پیش آئے ہیں۔

[1] الفاروق عمر محمد حسین ہیکل جلد ۲ صفحہ ۱۹-۲۱۸

پہلا واقعہ مدینہ اور خاص عہد رسالت سے تعلق رکھتا ہے۔ مدینہ کے متعلق معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک دن بھی امن ایسا نہیں گذرا ہے جب وہاں ہنگامی حالت STATE (OF EMERGENCY) نہ رہی ہو۔ ریاست ابھی نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ اندر بھی انتشار موجود تھا، اور بیرونی حملہ کا خطرہ بھی ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ ایک طرف پہلو میں یہود سرگرم سازش تھے۔ دوسری طرف عین مسلمانوں کے اندر منافقین ففتھ کالم کی حیثیت سے اسلامی سوسائٹی کے ہر حصہ میں سنسنی اور انتشار پھیلانے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے۔ ان کی جنگی تیاریوں کی جاسوسی اور ان کے فوجی رازوں کو معلوم اور آشکارا کرنے کے لئے دن رات جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کے خطرہ کا یہ حال تھا کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہو گیا اس وقت تک قریش خود مدینہ کے یہود اور منافقین کے سازباز کے ساتھ حملے پر حملے کرتے رہے۔ قریش کے حملوں سے نجات ملی تو منتشر قبائل نے زور باندھا ان کا زور ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا کہ رومیوں اور غسانیوں کے خطرے نمودار ہو گئے یہ خطرات ابھی دور نہیں ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔

یہ تھے وہ حالات جن کے اندر مدینہ کی پولیس نے کسی شبہ کی بنا پر چند آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان اسیروں کا ایک پڑوسی یہ معلوم کر کے کہ اس کے کچھ پڑوسی زیر حراست ہیں فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ آں حضرت ۔۔۔۔ اس وقت خطبہ دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ اتنا بھی توقف نہیں کرتا کہ آپ خطبہ سے فارغ ہو جائیں تو اپنی بات کہے بلکہ عین خطبہ میں آپؐ کو ٹوک کر پوچھتا ہے کہ میرے پڑوسی کس قصور میں پکڑے گئے ہیں؟ آپ خطبہ میں مشغول رہتے ہیں اور اس بات کا کوئی جواب نہیں دیتے ہیں اس پر وہ شخص باصرار اپنے سوال کو دہراتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں لیکن کیا جواب؟ یہ جواب نہیں کہ میری حکومت نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے سے پہلے ان کے قصوروار ہونے کے بارہ میں اطمینان کر لیا ہے، اب ان کے وجوہ گرفتاری کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ایسا کرنا ریاست اور امن عامہ کے تحفظ کو خطرہ میں ڈال دے گا اور حکومت کے ذرائع معلومات کو ضائع کر دے گا۔ بلکہ آپ فوراً سائل کے پڑوسیوں کی رہائی کا حکم جاری فرما دیتے ہیں اور اس فعل سے اسلامی ریاست کے شہریوں کے اس دستوری حق پر ہمیشہ کیلئے مہر تصدیق ثبت فرما دیتے ہیں کہ محض شبہ یا الزام پر کسی شہری کو قید کر دینا جائز نہیں ہے۔ یا اس پر جرم ثابت کر کے اسے ٭ حاکم — جو صرف حاکم اعلیٰ ہی نہیں بلکہ اس ملک کا فاتح بھی ہے۔ بعض مصالح کے تحت، مفتوح قوم کے ایک شخص کو پکڑ کر قید کر دیتا ہے۔۔ اسلامی قانون کی رو سے یہ ایسا سنگین جرم ہے کہ فاروق اعظمؓ کو اطلاع ملتے ہی گورنر بہادر اور ان کے صاحبزادے کی مصر سے مدینہ طلبی کا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ فوراً معاملہ کی تحقیق

٭ یہاں کچھ عبارت چھوٹ گئی ہے، وہ صفحہ ۴۰ پر دیکھئے۔

کی جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جانے پر کہ اس مصری کو بلاوجہ پیٹا گیا اور اس کے بعد یونہی پکڑ کر قید کر دیا گیا نہ صرف گورنر صاحب کے صاحبزادے سے اسے برسرِ عام قصاص دلایا جاتا ہے بلکہ مصر کی ہنگامی حالت، دشمن کے خطرہ، اندرونی خلفشار، سیاست اور امنِ عامہ کے تحفظ، حکومت کے رعب و دبدبہ سے قطع نظر کر کے خود گورنر بہادر کو مستوجب سزا ٹھہرایا جاتا ہے کہ انہیں ایک شخص کو اس کا قصور ثابت کئے بغیر یونہی غلاموں کی طرح سے پکڑ کر جیل میں ٹھونس دینے کا اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا؟

تیسرا واقعہ عراق سے تعلق رکھتا ہے۔ عراق میں اگرچہ خود اس وقت باقاعدہ کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی لیکن وہاں جنگی حالت (STATE OF WAR) بدستور موجود تھی۔ اول تو یہ ملک خود ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا اور اس کے باشندوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے پاس ہی ایران میں جو فیصلہ کن جنگ لڑی جا رہی تھی اس کا بھی فوجی اڈہ (BASE) عراق ہی تھا۔ اس وجہ سے دشمنوں کے ایجنٹوں، جاسوسوں اور دوسرے تخریبی کارروائیاں کرنے والے عناصر کی سرگرمیوں کا یہاں بڑا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ ان حالات کے اندر ایک شہری (غالباً) یہ معلوم کر کے کہ اس کے متعلق حکومت میں کچھ غلط صحیح رپورٹ پہنچ چکی ہے اور عجب نہیں کہ سابق ایرانی حکمرانوں کی طرح اسے یونہی گرفتار کر کے قید کر دیا جائے گا، ہوا مدینہ پہنچتا ہے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ امیر المومنین میرے خلاف محض جھوٹی اطلاعات کی بنا پر جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے ایک سازش کی گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کو بہانہ بنا کر مجھے گرفتار نہ کر لیا جائے۔ حضرت عمرؓ اس کی یہ شکایت سن کر پہلے تو تعجب کا اظہار فرماتے ہیں، کہ اچھا یہ باتیں جن کی پیشین گوئی فتنوں کے ظہور کے سلسلہ میں کی گئی ہے اس امت کے اندر ظاہر ہونی شروع ہو گئیں۔؟ پھر اس کو اطمینان دلاتے ہیں کہ تم پریشان نہ ہو لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل۔ اسلامی دستور کی رو سے کوئی شخص عدل کئے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کو اس بات کا اطمینان قسم کھا کے دلاتے ہیں اور ساتھ ہی "فی الاسلام" کے الفاظ بھی استعمال فرماتے ہیں۔ "فی الاسلام" کے الفاظ سے آپ کا مقصود اس امر کو واضح فرمانا تھا کہ یہ ضمانت میں ذاتی و شخصی حیثیت سے نہیں دے رہا ہوں بلکہ یہ ضمانت اسلامی دستور نے اپنے ہر شہری کو خود دے رکھی ہے اور اس کی اس ضمانت میں کوئی شخص کسی حال میں سرمو مداخلت کا مجاز نہیں ہے۔ اس لئے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے خلاف جھوٹی رپورٹیں [illegible] ہیں تو ہونے دو۔ کوئی طاقت تم پر اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈال سکے گی جب تک باضابطہ عدالت کے ذریعہ سے تمہارا جرم ثابت نہ کر دیا جائے۔

پس یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اسلامی قانون میں اس بات کی کسی حالت میں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کسی شہری کو باضابطہ عدالتی کارروائی کے بغیر سزا دی جا سکے اور "باضابطہ عدالتی کارروائی" سے ہماری مراد اس کے ان تمام شرائط کے ساتھ انجام پانے کے ہیں جو اسلام نے قضا کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ اگر انصاف کی دس شرطوں میں سے نو شرطیں پوری کر دی گئی ہوں اور صرف ایک ہی شرط پوری کرنے سے رہ جائے تو ساری کی ساری کارروائی اسلامی قانونِ قضا کی رو سے کالعدم اور بے معنی ہو کے رہ جائے گی۔ اس طرح اگر کسی شخص کو سزا دے دی گئی تو اسلامی قانون کی رو سے یہ سزا سراسر ظلم اور "بغیر العدل" ہی تصور ہو گی اگرچہ وہ شخص جس کو سزا دی گئی ہے فی الواقع اس جرم کا مرتکب ہوا ہو جس کو بنا قرار دے کر اس کو سزا دی گئی ہے۔ ہرچند یہ موقع اسلامی شرائطِ قضا پر بحث کرنے کا نہیں ہے لیکن اسلامی قانونِ قضا کا اجمالی تصور دلانے کے لئے اس سلسلہ کی ایک حدیث کو یہاں درج کر دینا بے محل نہیں ہو گا۔

عن علیؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا علی! اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینهما حتی تسمع من الآخر کما سمعت من الاول (ابو داؤد ۔ ترمذی ۔ احمد)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! جب تمہارے سامنے دو فریق معاملہ پیش ہوں تو ان کے بیچ اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے سے بھی اس کا بیان اسی طرح نہ سن لو جس طرح پہلے کا بیان سنا ہے۔

اس چیز کی ضرورت کو بائبل میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے: "جو پہلے اپنا دعوے بیان کرتا ہے راست معلوم ہوتا ہے، پر دوسرا آ کر اس کی حقیقت ظاہر کرتا ہے۔"

کسی شہری کو اس کا جرم ثابت کئے بغیر گرفتار کرنے اور گرفتار رکھنے کی جو زیادہ سے زیادہ گنجائش اسلامی قانون میں ہے وہ بس اس حد تک ہے کہ کسی معاملہ کی تفتیش و تحقیق کے لئے کچھ دیر کے لئے اس کو زیرِ حراست رکھ دیا جائے۔ تفتیش کے بعد اگر وجوہ موجود ہیں تو اس پر مناسب عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلایا جاتا ہے جہاں اس کو اپنی صفائی پیش کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں اور اگر وجوہ نہیں ہیں تو اس کو فوراً آزاد کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام خطابی فرماتے ہیں:

قال الخطابی ان الحبس علی ضربین حبس عقوبۃ وحبس استظهار

حبس (DETENTION) کی دو قسمیں ہیں: ایک سزا کے طور پر اور دوسرا پوچھ گچھ

فالعقوبة لاتكون الا فى واجب و اما ما كان فى تهمة فانما يستظهر بذالك يستكشف به ما وراءه، الا وروى انه حبس رجلا فى تهمة ساعة من النهار ثم خلى عنه

(معالم السنن۔ کتاب القضاء)

تفتیش کے لئے جو سزا کے طور پر ہے۔ وہ صرف اس حالت میں جائز ہے جب (جرم) ثابت ہو اور (سزا) ازروئے قانون واجب ہو باقی اگر کسی شخص پر کوئی الزام ہو تو پوچھ گچھ کے لئے اسے روک سکتے ہیں۔ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کسی الزام میں کسی شخص کو کچھ دیر کے لئے روکا، پھر اسے رہا کر دیا۔

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جو سلطنت عباسیہ جیسی عظیم الشان سلطنت کے اس زمانہ میں چیف جسٹس تھے جو زمانہ اس کی انتہائی وسعت کا تھا ان تمام ضروریات سے اچھی طرح آشنا ہونے کے باوجود جو ایک وسیع سلطنت کو پیش آسکتی ہیں اس بارے میں جو کچھ فرماتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ محض الزام کی بنا پر کسی شخص کو حوالات میں رکھنے کو بھی ناجائز سمجھتے تھے چنانچہ کتاب الخراج (صفحہ ۱۰۷) میں فرماتے ہیں۔

ولا يحل ولا يسع ان يحبس رجل بتهمة رجل له۔ كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا ياخذ الناس بالقرف۔ و لكن ينبغى ان يجمع بين المدعى والمدعى عليه۔ فان كان له بينة على ما ادعى، حكم بها و الا اخذ من المدعى عليه كفيل وخلى عنه۔ فان ادعى المدعى عليه بعد ذالك شيئا والا لم يتعرض له۔

نہ یہ بات جائز ہے اور نہ اس کے جائز ہونے کی کوئی گنجائش ہے کہ کسی شخص کو محض اس بنا پر حوالات میں ڈال دیا جائے کہ ایک شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجرد الزام کی بنا پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کرتے تھے بلکہ ایسی صورت میں تو کرنا یہ چاہئے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا جائے۔ اگر مدعی کے پاس ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دیا جائے ورنہ مدعا علیہ سے ضمانت لے کر اس کو رہا کر دیا جائے اگر اس کے بعد مدعی کچھ ثبوت فراہم کرتا ہے تو خیر، ورنہ مدعا علیہ سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

مگر اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ یہاں ساری بحث ان لوگوں سے متعلق ہے جو

اسلامی ریاست کے باضابطہ شہری ہوں۔ اپنے شہریوں کو اسلامی ریاست جس قانونی حفاظت کی گارنٹی دیتی ہے، یہ بات اس کے عین لوازم میں سے ہے کہ جب تک باقاعدہ عدالتی ثبوت و شہادت کے ذریعے سے کسی شہری کا کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے نہ تو اس کو کوئی سزا دی جائے اور نہ اس کی شخصی آزادی میں کسی قسم کی کوئی دوسری مداخلت کی جائے خواہ اس کے الزام کی نوعیت کتنی ہی سنگین ہو اور ریاست کتنے ہی مشکل اور نازک حالات سے دوچار ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ ریاست کے کسی شہری کو بغیر ثبوت و شہادت اور بغیر ان کو صفائی کا موقع دیئے کوئی سزا دی گئی ہو۔ البتہ اس بات کی ایک دو مثالیں خود حضور کی زندگی میں ملتی ہیں کہ کسی موقعہ پر دشمن کا کوئی جاسوس مسلمانوں (ریاست) کے اندر گھس آیا اور آپ نے اس کے تعاقب کرنے یا اس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن اس بات کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے کہ ریاست کے کسی شہری سے متعلق کبھی اس طرح کا حکم دیا گیا ہو۔ حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اہل مکہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارادے کی اطلاع بھیجی تھی کہ آپ مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہو گیا۔ حاطب بن ابی بلتعہ کا بھیجا ہوا خط بھی پکڑ لیا گیا۔ یہ معاملہ جس درجہ سنگین ہے اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے اور اس وقت حالات جس درجہ نازک تھے اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم بغیر ثبوت و شہادت اور بغیر ان کو صفائی کا موقع دیئے سزا دینا تو درکنار آپ نے ان کو ملزم بھی نہیں گردانا۔ مسجد میں جو عدالت گاہ بھی تھی ان کا معاملہ پیش ہوا۔ انہوں نے اپنے جرم کا اقرار بھی کیا لیکن چونکہ واقعات سے ثابت ہوا کہ ان کے اس اقدام کی محرک کوئی بددیانتی اور ریاست کی بدخواہی نہ تھی بلکہ محض ایک فطری کمزوری تھی۔ اس وجہ سے ان کو معاف کر دیا گیا۔

بہرحال دو صورتیں ہیں اور دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی غیر ریاست کا باشندہ یا دشمن کا کوئی جاسوس اسلامی ریاست کے اندر گھس آئے اور دوسری صورت یہ ہے کہ خود ریاست کے کسی شہری پر جاسوسی کا الزام یا شبہ ہو۔ پہلی صورت میں ریاست مجاز ہے کہ حسب حالات جو کارروائی مناسب سمجھے اس کے خلاف کرے لیکن دوسری صورت میں ریاست ایک اور صرف ایک ہی راستہ اس کے خلاف اختیار کر سکتی ہے اور وہ ہے باقاعدہ عدالتی کارروائی کا راستہ۔ اس کے سوا اگر اس نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو یہ اللہ اور اس کے رسول کے نام سے دی ہوئی ضمانت پر کھلا ہوا حملہ ہوگا۔

۴۔ درخواست فریاد اور اعتراض کا حق

اسلامی حکومت میں ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کو کوئی خاص ضرورت درپیش ہے یا کسی نے اس پر ظلم کیا ہے، حکومت کے کسی کارکن کے سلوک سے اس کو دکھ پہنچا ہے، یا خود اسلامی حکومت کے امیر سے اس کو کوئی شکایت ہے تو وہ اس معاملہ کو براہ راست امیر کے یا کسی متعلق عہدیدار کے علم میں لا سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلام نے سائل یا مستغیث کو کسی خاص ضابطہ کا پابند نہیں بنایا ہے اگر وہ سرکاری ملازم ہے تو اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ وہ جس محکمہ میں ملازم ہے اس محکمہ کے واسطہ ہی سے اپنی درخواست و شکایت بھیجے۔ زبان، طرز و لہجہ، القاب و آداب کے بارہ میں بھی اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ جس زبان، جس انداز اور جس طریق پر اپنے مدعا کو پیش کر سکتا ہے۔ اس کو حق حاصل ہے کہ وہ امیرالمومنین کے سامنے اپنا مدعا پیش کر دے اور امیر مجبور ہے کہ اگر خود اس کے خلاف کسی حق کا دعویٰ ہے تو اس حق کو یا ادا کرے یا ضابطۂ ثبوت و شہادت کے تحت اپنی براءت ثابت کرے۔ اگر اس کے کسی رویہ پر کوئی اعتراض ہے تو اس کے متعلق اپنی معذرت (EXPLANATION) پیش کرے۔ اگر سائل ضرورت مند ہے تو اس کی ضرورت پوری کرے اور اگر اس پر کسی نے ظلم کیا ہے تو اس کی داد رسی کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لوگ ہر قسم کی شکایتیں اور درخواستیں جس بے تکلفی بلکہ بسا اوقات جس آزادی اور گستاخی کے ساتھ پیش کرتے تھے اور آپ ان درخواستوں اور شکایتوں پر جس طرح بلا تاخیر کارروائی کرتے تھے اس کی بکثرت مثالیں سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن ممکن ہے بعض لوگ ان باتوں کو پیغمبرانہ حلم و عفو پر محمول کر کے یہ عذر کریں کہ روزمرہ کی سیاسی اور عملی دنیا میں یہ اعلیٰ پیغمبرانہ اخلاق نہیں برتا جا سکتا اور نہ یہ تمام انسانوں کے بس کی بات ہے اس وجہ سے اس سلسلہ میں ہم اپنی بحث صرف خلافت راشدہ کے طرز عمل تک محدود رکھیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے وہ کسوٹی خود رکھ دی تھی جو ایک اسلامی حکومت کے خلیفہ کے جانچنے کے لئے معیار کی حیثیت رکھتی تھی اور لوگوں کو پورا اختیار دے دیا تھا کہ وہ ان کو اس کسوٹی پر برابر پرکھتے رہیں اور جب دیکھیں کہ اس معیار سے وہ ذرا بھی ہٹ رہے ہیں تو ان کو فوراً درست کرنے کی کوشش کریں اور اس میں ذرا بھی رو رعایت نہ کریں۔ وہ اپنے آپ کو جس حد تک رعایت کا مستحق سمجھتے تھے اس کو بھی انہوں نے بیان کر دیا تھا اور اپنے اندر جو بعض کمزوریاں محسوس کرتے تھے ان کو بھی بے تکلف ظاہر کر دیا تھا تاکہ لوگوں کو ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی

زحمت پیش نہ آئے۔ جس معیار سے انہوں نے لوگوں کو اپنے آپ کو جانچنے کا حکم دیا تھا وہ اتباعِ رسول کا معیار تھا وہ رسولؐ کے خلیفہ تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ اقرار کیا کہ ان کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ رسول کے معین کئے ہوئے راستے پر چلیں اور کوئی نئی راہ اپنی اپج سے نہ نکالیں اور اگر اس راستہ سے وہ ذرا بھی ادھر ادھر ہوں تو لوگوں کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ان کو بے تکلف ٹوکیں اور جس طرح ممکن ہو ان کو اصلی راہ پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ اس معاملہ میں بس اتنی رعایت وہ چاہتے تھے کہ اول تو ان کو ٹھیک ٹھیک معیار نبوت پر جانچنے کی کوشش نہ کی جائے کہ بہرحال وہ ایک عام انسان ہیں کوئی معصوم پیغمبر نہیں ہیں۔ دوسری یہ کہ ان کے مزاج میں ایک ذرا سی جو تیزی ہے اور جو کبھی کبھی غالب آ جایا کرتی ہے، لوگ اس کا تھوڑا سا لحاظ رکھیں کہ کوئی ایسا موقعہ بلاوجہ نہ پیدا ہو کہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہو جائے۔ یہ ساری باتیں انہوں نے خلیفہ ہونے کے فوراً بعد ہی اپنی اس تقریر میں ظاہر فرما دی تھیں جو حضرت اسامہؓ کا لشکر بھیجتے وقت لوگوں کے سامنے کی تھی خود ان کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

یا ایہا الناس انما انا مثلکم وانی لا ادری لعلکم ستکلفونی ما کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یطیق۔ ان اللہ اصطفٰی محمدا صلے اللہ علیہ وسلم وعصمہ من الآفات وانما انا متبع ولست بمبتدع فان استقمت فتابعونی وان زغت فقومونی الا وان لی شیطانا یعترینی فاذا اتانی فاجتنبونی۔ [1] (سیرۃ الصدیق۔ ابوبکر۔ محمد حسین ہیکل ص ۹۰)	لوگو! میں بالکل تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم ممکن ہے تم مجھ سے وہ توقعات باندھ بیٹھو جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پوری فرما سکتے تھے ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے لئے منتخب فرمایا تھا اور تمام شیطانی آفتوں سے آپ کو محفوظ کیا تھا میرا یہ مقام نہیں ہے۔ میرا مقام تو ایک متبع کا ہے میں بہرحال کوئی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں پس اگر نبی کی روش پر استوار ہوں تو میری پیروی کرنا اور اگر راہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے درست کرنا۔ یاد رکھو میرے ساتھ ایک شیطان ہے جو کبھی کبھی مجھے لاحق ہو جاتا ہے تو اگر کبھی دیکھو کہ وہ میرے اوپر آ گیا ہے تو ذرا مجھ سے بچ جانا۔

[1] صدیق اکبرؓ کی یہ شان ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے نفس [illegible] ایک معمولی کمزوری کو اس وجہ سے [illegible] کے بعد [illegible] میں ان الفاظ [illegible] اس کا اعتراف فرماتے ہیں اور [illegible] ان کی اس شدت احساس ہی کی برکت تھی کہ [illegible] اس کمزوری سے مغلوب ہونے سے محفوظ رکھا۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے مندرجہ ذیل اعلان فرمایا۔

اعقل والحق من نفسی، وا تقدم	میں اپنے آپ سے بھی حق وصول کروں گا اور اگر
وابین لکم امری فایما رجل	مجھ پر کوئی اعتراض ہوگا تو میں خود بڑھ کر اپنی صفائی
کانت لہ حاجۃ او ظلم مظلمۃ	پیش کروں گا تو جس شخص کو کوئی ضرورت ہو اس کو کسی
او عتب علینا فی خلق فلیؤذنی	ظلم کی شکایت ہو یا میرے اور میرے عمال کے کسی رویہ
فانما انا رجل منکم وانا حبیبٌ	پر اعتراض ہو تو مجھے باخبر کرے اور میں تم ہی میں سے
الی سد حکم وعزیزٌ علی عنتکم	ایک آدمی ہوں، تمہاری بہبود مجھے عزیز اور تمہاری
وانا مسئولٌ عن امانتی وما	تکلیف مجھ پر شاق اور میں اس امانت اور اس
انا دونہٗ (الفاروق عمر محمد حسین ہیکل صـ۱۰۱)	ذمہ داری کے لئے تمہارے سامنے جوابدہ ہوں

یوں تو فاروق اعظمؓ کے اس اعلان کا ایک ایک لفظ غور کے قابل ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ان الفاظ پر دوبارہ نظر ڈالئے۔ "فَلْيُؤْذِنِي فَاِنَّمَا اَنَا رَجُلٌ مِّنْكُمْ" (تو مجھے اس سے باخبر کردو، میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں) یہ نہیں فرماتے کہ میں اب امیرالمومنین بن گیا ہوں، اب اپنجانب کی بارگاہ میں کوئی درخواست (PETITION) یا کوئی معروضہ (REPRESENTATION) براہِ راست نہ آئے، اس کے لئے جو قواعد و ضوابط مقرر ہیں ان کی پابندی ضروری ہے۔ درخواست فلاں زبان میں لکھی جائے۔ کاغذ فلاں قسم کا استعمال کیا جائے، صفحہ میں سطریں اتنی ہوں، القاب و آداب یہ یہ ہوں، التماس مؤدبانہ اور التجا فدویانہ ہو اور ان سب باتوں کے ساتھ درخواست اپنے متعین راستہ (THROUGH PROPER CHANNEL) سے ہی آنی چاہئے۔ ورنہ التفات کے لائق نہیں سمجھی جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں تو نہایت سادگی کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو وہ بے تکلف مجھے آگاہ کرے۔ میں امیرالمومنین بن کے کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہوگیا ہوں کہ لوگ مجھ سے ڈرنے اور گھبرانے لگ جائیں یا مجھ سے ملنے اور کچھ کہنے کے لئے کسی اہتمام خاص کی ضرورت[1] پیش آئے، بلکہ لوگوں کا مقرر کیا ہوا ایک امین ہوں اور جو امانت لوگوں نے میرے سپرد کی ہے اس کے لئے ان کے آگے جوابدہ ہوں۔

[1] اس مقام پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام میں امیر ہر جمعہ کو خود پبلک کے سامنے پیش ہوتا ہے اور خطبہ میں اپنی پالیسی بیان کرتا ہے اور پبلک کو پورا موقع دیتا ہے کہ اس کو ٹوکے، اس کی پالیسی پر اعتراض کرے، اس سے سوالات کرے اور اس کے سامنے اپنی شکایات پیش کرے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے اس اعلان کی صداقت کو جس طرح نبھایا اور لوگوں کے اس حق کا جس طرح احترام کیا اس کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے دو ایک واقعات کا ذکر غالباً اس موقع پر مناسب ہوگا ان واقعات سے کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ اسلامی حکومت کے اندر لوگوں کو اپنی شکایتیں پیش کرنے اور بڑے بڑے اشخاص یہاں تک کہ خود امیرالمومنین پر اعتراض کرنے کی کس حد تک آزادی حاصل ہوتی ہے اور اسلامی حکومت کے امیرالمومنین کو لوگوں کی عام سطح سے کتنا قریب اور ان کے مطالبات و حقوق اور ان کی صداؤں اور فریادوں کے لئے کتنا گوش بر آواز رہنا پڑتا ہے اور اس کو ان کی جلی کٹی سب کچھ کس حلم و صبر کے ساتھ سننی اور برداشت کرنی پڑتی ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد سے نکلے جارود عبدی آپ کے ساتھ تھے۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک خاتون دوسری جانب سے سامنے آنکلیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب تو دے دیا۔ لیکن پھر فوراً ہی حضرت عمرؓ پر برس پڑیں۔ بولیں، عمرؓ تمہارے حال پر افسوس ہے میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے کہ تم عمیر کہلاتے تھے۔ اور لٹھیا لئے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے پھرتے تھے اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا جب تم عمرؓ کہلانے لگے۔ اور اب یہ زمانہ دیکھ رہی ہوں کہ امیرالمومنین بنے پھر رہے ہو۔ رعایا کے معاملہ میں خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈریگا وہ آخرت کے بعید عالم کو اپنے آپ سے قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہوگا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہے گا کہ خدا کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ ہونے پائے۔ جارود ان کی یہ تقریر سننے کے بعد بولے کہ آپ نے امیرالمومنین کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جارود سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ یہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں ان کو کہنے دو۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ یہ خولہ بنت حکیم ہیں[1]، ان کی بات تو اللہ تعالےٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سنی تو عمر کی کیا ہستی ہے کہ وہ ان کی بات نہ سنے[2]۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے چادریں آئیں۔ آپ نے وہ چادریں مسلمانوں میں تقسیم کیں۔ ہر مسلمان کے حصہ میں ایک ایک چادر آئی اور حصے کے مطابق ایک ہی چادر حضرت عمرؓ کو بھی ملی حضرت عمرؓ نے اس چادر کی قمیض بنوائی اور اس کو پہن کر منبر پر چڑھے اور ایک خطبہ دیا جس میں مسلمانوں کو

[1] ان کے شوہر نے جاہلیت کے طریقہ طلاق جسے ظہار کہتے ہیں کے مطابق ان کو طلاق دے دی تھی جس کیلئے انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے شکوہ کیا اور سورہ مجادلہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکایت سنی اور کفارہ ظہار کا حکم نازل فرمایا۔

[2] الاستیعاب لابن عبدالبر جلد ۲ صـ۷۲۳

جا در پر اعتراض کیا۔ ایک شخص نے وہیں اٹھ کر کہا کہ ہم نہ آپ کی بات سنیں گے اور نہ مانیں گے حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کیوں ؟ اس نے جواب دیا آپ نے اپنے آپ کو ہمارے اوپر ترجیح دی ہے یمن سے جو چادریں آئی تھیں ان میں ہر ایک کو ایک ایک چادر ملی اور ایک ہی چادر آپ کا بھی حصہ تھی اور وہ آپ کے لئے کافی نہ تھی۔ پھر آپ نے اتنے لمبے آدمی ہونے کے باوجود اس سے قمیض کس طرح تیار کرالی ؟ حضرت عمرؓ نے وہیں اپنے فرزند عبداللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا، عبداللہ تم اس اعتراض کا جواب دو۔ انھوں نے کھڑے ہو کر یہ کہا کہ میں نے اپنے حصہ کی چادر بھی والد ماجد کو دے دی تھی اور اس سے یہ لباس تیار ہوا ہے۔ معترض نے یہ سنا تو بولا کہ اب کہئے۔ ہم سنیں گے اور مانیں گے۔ [1]

صفحہ ۴۳ کی چھٹی ہوئی سطور :۔

قانون کے مطابق سزا دو اور اگر ثابت نہیں کر سکتے تو اسے چھوڑ دو۔

دوسرا واقعہ مصر سے متعلق ہے۔ زمانہ فاروق اعظم کی خلافت کا ہے۔ مصر ابھی نیا نیا فتح ہوا ہے۔ جن کے ہاتھوں سے ملک چھینا گیا ہے وہ سرحدوں پر بھی پرے جمائے موجود ہیں اور اپنے مرکز میں بھی پورے زور و قوت کے ساتھ موجود ہیں اور مصر کو واپس لینے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ اندرونی خلفشار بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ملکی آبادی ہر چند سابق حکمرانوں سے خوش نہیں تھی لیکن نئے حکمرانوں سے اس کے مطمئن ہونے کے لئے بھی کم از کم بالفعل کوئی وجہ موجود نہیں ہے اندرونی بغاوت پھوٹ پڑنے کا ہر وقت اندیشہ ہے اور بیرونی حملے کا خطرہ بھی ابھی دور نہیں ہوا ہے۔ ــــ ایسے حالات میں دنیا کے عام دستور کے مطابق تو مفتوحہ ملک برا و راست فوج کے کنٹرول اور فوجی قانون کے تحت رہا کرتا ہے اور مفتوحین کی شہری آزادی کا تو کیا ذکر وہاں سرے سے شہری قانون ہی کا وجود نہیں ہوتا۔ مگر انہی حالات میں ایک اسلامی ریاست کے اندر کوئی پولیس کمشنر نہیں، ملک کا سب سے اعلیٰ سب سے ذمہ دار اور سب سے بااختیار

[1] الفاروق عمر، محمد حسین ہیکل جلد ۲ صفحہ ۲۱۶

الدنيا ملعونٌ و ملعونٌ ما فيها الا ذكر الله و ما والاهٗ او عالمٌ او متعلمٌ (حدیث نبوی)

پوری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب قابل لعنت ہے سوائے ذکر الٰہی کے یا اس کے جو اس سے متعلق ہو یا عالم یا طالب علم

مولانا امین احسن اصلاحی

کا

ہفتہ وار درس قرآن

اب ہر جمعہ کو بعد نماز عصر جامع مسجد ہرن روڈ کرشن نگر

لاہور میں منعقد ہو رہا ہے

(آجکل سورۃ اعراف زیر درس ہے!!)

اس کے علاوہ

حلقہ ہائے مطالعہ قرآن

کے اجتماعات حسب ذیل پروگرام کے مطابق منعقد ہوتے ہیں

- سمن آباد۔ اتوار۔ صبح ۱/۲ ۹ بجے ۔ ۲۱۱ لے (این) سمن آباد

(نوٹ) اس نشست میں خواتین کے لئے پردے کا بندوبست بھی ہے اور لاؤڈ سپیکر کا اہتمام بھی۔

- کرشن نگر (۱) بدھ۔ بعد نماز عشاء ۔ مکان نمبر ۱۲، عمر روڈ کرشن نگر

نوٹ : اس نشست میں بھی خواتین کے لئے پردے کا بندوبست ہے۔

- کرشن نگر (۲) پیر ۔ بعد نماز عشاء ۔ جامع مسجد، ہرن روڈ کرشن نگر

ڈاکٹر اسرار احمد درس دیتے ہیں۔

شرکت کی عام دعوت ہے

كن عالماً او متعلماً او سامعاً ولا تكن رابعاً

(عالم ، متعلم یا سامع میں سے ایک ضرور بنو!)

بقیہ: نیکی میں سبقت کا جذبہ، صفحہ ۶۵ سے آگے

اور تفریح میں عیاشی اور عیش پرستی کے رجحان کو ختم کیا جائے۔ معاشرے میں سے تمباکو نوشی کی عادت کو بھی کم کرنا چاہیئے۔ ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ اس بُری عادت کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات سادہ اسلامی طریقے سے سرانجام دی جائیں اور تمام غیر اسلامی رسموں کو ترک کر دیا جائے۔

تفریحات کو بھی ایک حد کے اندر رکھا جائے۔ بے حیائی، فحاشی اور بد اخلاقی کو فروغ دینے والی تفریحات کو روکا جائے اور قوم کے مذاق کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ بُری چیز کو بُرا سمجھیں اور اچھی چیز کو اچھا۔ نہ یہ کہ بگڑے ہوئے مذاق کی تسکین کے لئے سامان مہیا کئے جائیں اور ان میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

اگر ملک کا سمجھ دار طبقہ اِدھر متوجہ ہو جائے تو ملک سے عیاشی کے رجحان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں بُرائی اس لئے پھیلتی ہے کہ نیک لوگ اجتماعی طور پر کچھ نہیں کرتے۔ اس کے لئے حکومت کو بھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اہل حل و عقد کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں مناسب کارروائی کریں۔ اس کی خاطر ماہرین کے مشورے سے قواعد اور ذیلی قواعد بنائے جا سکتے ہیں۔

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟ ● آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیام پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور ● اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریک جماعت اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر اسرار احمد — ایم اے۔ ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیتہ طلبا پاکستان و امیدوار جماعت اسلامی منٹگمری

ضخامت ۲۰۰ صفحات : سائز بڑا : طباعت آفسٹ مجلد مع گردپوش

قیمت چار روپے : علاوہ محصول ڈاک

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور

ڈاکٹر محمد نذیر مسلم

نیکی میں سبقت

کا جذبہ اسلامی معاشرہ کی جان ہے

انسان فطری طور پر سبقت پسند ہے۔ وہ زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے بازی لے جانے کا بے پناہ جذبہ لئے ہوئے ہے۔ انسان کا یہی جذبہ اس کی بے کیف زندگی میں بہار لاتا اور خاموش فضاؤں میں ہماہمی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ایک بچہ کھیل کے میدان میں اپنے ہمجولیوں کو مات دے کر جو حظ محسوس کرتا ہے وہ اسے کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ تعلیمی مقابلے طالب علموں میں تعلیم کا ذوق و شوق ابھارتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں یہی جذبہ نئی تخلیقات کا ذریعہ بنتا ہے۔ سائنس دانوں میں مسابقت کا ذوق و شوق ایجادات کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ ایک طالب علم کی یہ تمنا ہے کہ وہ علم کے میدان میں سب سے بازی لے جائے۔ ایک پہلوان زمانہ بھر کے پہلوانوں سے اپنی قوت کا لوہا منوانا چاہتا ہے۔ ایک سپہ سالار کی یہ خواہش ہے کہ اسے خالد و طارق اور سکندر و نپولین کی صف میں جگہ ملے غرضیکہ جو شخص جس میدان میں مصروف عمل ہے وہ اس میدان میں اپنے ہمسروں سے کوسوں آگے نکل جانے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان کا یہ جذبہ فطری حدود میں رہے تو اس میں انسانیت کی فوز و فلاح کے بے شمار پہلو ہیں۔ لیکن اگر یہ جذبہ کوئی غلط رخ اختیار کرے تو اس سے ایسے ایسے فتنے رونما ہوتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر انسانیت چیخ اٹھتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر زور آزمائی کا جذبہ کشتی کے میدان کے بجائے مار دھاڑ اور قتل و غارت کی راہ اختیار کرے تو یہی انسان ڈاکوؤں اور رہزنوں کا سرخیل بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر زر اندوزی کا بھوت کسی کی گردن پہ سوار ہو جائے تو یہی جذبہ انسان کو سمگلر، ذخیرہ اندوز حتیٰ کہ وطن فروش تک بنا دیتا ہے۔ بعینہٖ اگر قومیت و وطنیت کا نشہ کسی کی فتور عقل کا باعث بن جائے تو پھر یہی انسان ہٹلر اور مسولینی کے روپ میں دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اور اگر کسی قوم کے اجتماعی نظریات میں فتور آ جائے تو یہی جذبہ ذات پات کی تمیز اور رنگ و نسل کی برتری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے چودہ سو سال پیشتر انسان کا یہی جذبہ ایک غلط رخ اختیار کر چکا تھا۔ ایک عرب اپنے قومی میلوں میں اپنا

قبائلی اور نسلی تفوق جتاتا تھا۔ کوئی لوٹ مار اور قتل و غارت کے کارناموں کو فخر سے بیان کرتا تھا۔ کوئی اپنی عشق بازی کی داستان مزے لے لے کر سناتا تھا۔ کوئی مے نوشی اور شاہد پرستی کی حکایات نمک مرچ لگا کر پیش کرتا تھا۔ غرضیکہ عرب کا انسان قتل و غارت، لوٹ مار، فسق و فجور، بے حیائی و بدکاری اور نسلی و قبائلی برتری کی دوڑ میں اپنے ہمعصروں کو مات دینے میں مصروف تھا کہ ایسے حالات میں قرآن کی الہامی زبان سے دلوں کو وجد میں لانے والے نغمے پھوٹے اور عرب کی فضائیں ایمان و اسلام کے پاکیزہ جذبات کا مظہر بن گئیں۔ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

• خوب جان لو دنیا کی زندگی محض لہو و لعب، زینت، ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے پر اپنی برتری جتلانا ہے۔ اس کی مثال بارش کی سی ہے جس کے ذریعہ اُگنے والی نباتات کسان کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ قوت پکڑتی ہے اور پھر تُو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔ خوب یاد رکھو آخرت میں عذاب شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی۔ اور دنیاوی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔ دوڑ لگاؤ اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہے اور جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور اللہ ہی بڑے فضل والا ہے۔" (الحدید۔ رکوع ۳)

• اور دوڑ لگاؤ اللہ کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہے جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔" (آلِ عمران آیت ۱۳۳)

• "نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔" (البقرہ ۱۴۸)

• اور اس میں (آخرت کی نعمتوں کی حرص میں) ایک دوسرے سے آگے بڑھنے والوں کو آگے بڑھنا چاہیئے (سورہ مطففین آیت ۲۶)

قرآن کی اس ولولہ انگیز اور ایمان افروز پکار نے عربوں کے دل ہلا دیئے اور کتابِ الٰہی نے ان کی سوچ بچار کے زاویے بدل کر رکھ دیئے۔ عرب کے انسان میں بازی جیت جانے کا جذبہ فطری حدود کا پابند ہو چکا تھا۔ اب اس جذبہ کا مرکزی نقطہ سرتاپا تبدیل ہو گیا تھا کیونکہ اب ان کے مابین مقابلہ سفلی جذبات کے لئے نہیں بلکہ لافانی مسرتوں کے لئے تھا۔

جب اصحابِ رسول ؐ نیکی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جذبہ لے کر اٹھے تو انہوں نے انسانیت

کے سامنے مقابلہ کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کا نتیجہ ایک دوسرے کی غم خواری، حق و صداقت کی سربلندی، عدل و انصاف کا قیام، غریب پروری کا ذوق و شوق، محبتِ رسول ؐ کی تڑپ، رضائے الٰہی کی طلب اور آخرت کی کامیابی کے ولولے ہیں۔

دیکھئے مدینہ کے چند مفلس مسلمان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں اور عرض پرداز ہیں "اے اللہ کے رسول ؐ! امت کے مالدار نیکی میں ہم سے آگے بڑھ گئے۔ ہم نمازیں پڑھتے ہیں وہ بھی نمازیں ادا کرتے ہیں۔ ہم روزے رکھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس مال نہیں ہے وہ اپنے مال کے ذریعہ صدقات و خیرات کرتے ہیں۔ حج و عمرہ کے لئے جاتے ہیں اور جہاد کا ساز و سامان کرتے ہیں۔" حضور ؐ نے فرمایا "اچھا میں تمہیں وہ عمل بتاتا دیتا ہوں کہ جب تک کوئی دوسرا وہی عمل نہیں کرے گا نیکیوں میں تم سے برابری نہیں کر سکے گا۔" فرمایا "ہر فرض نماز کے بعد تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر پڑھا کرو۔" غرباء کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں کیونکہ ان کے لئے بازی جیتنے کا سامان ہو گیا تھا مگر جب امراء نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہر فرض نماز کے بعد ٹھہر کر کوئی چیز پڑھتے ہیں تو انہوں نے اپنے غریب بھائیوں سے دریافت کیا کہ نماز کے بعد آپ ٹھہر کر کیا پڑھتے ہیں؟ چونکہ وہاں رشک تھا حسد نہیں تھا نیکی کمانے کی تمنا تھی علم کو چھپانے کا جذبہ نہ تھا انہوں نے پوری بات من و عن ان کے سامنے بیان کر دی۔ اب امراء نے بھی حمد و ثنا کے ان کلمات کو ہر نماز کے بعد اپنا وظیفہ بنا لیا۔ غرباء دوبارہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ ہمارے امراء نے بھی حضور ؐ کے بتائے ہوئے کلمات کو ہر نماز کے بعد پڑھنا شروع کر دیا۔" حضور ؐ نے شفقت سے فرمایا "یہ تو اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کر دے۔"

مگر جاں نثارانِ رسول ؐ مغفرت و رحمت کی جس راہ پر چلے تھے ضروری نہیں کہ اس راہ میں مال ہی کی حیثیت ہو وہاں جذبۂ خیر کے ساتھ ساتھ جس قدر زیادہ نیت میں خلوص ہوگا اسی قدر زیادہ بارگاہِ الٰہی میں قدر و منزلت کا مقام پائے گا۔ دیکھئے دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضور ؐ نے اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر نکل کر دشمن کو روکنے کا فیصلہ فرمایا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ مسلمان بڑھ چڑھ کر جہاد کی تیاری میں حصہ لیں چنانچہ آپ نے لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور جہاد پر خطبہ ارشاد فرمایا اور اللہ کی راہ میں مال و متاع خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ نیز زبانِ رسالت ؐ سے یہ الفاظ ادا ہوئے "لشکر کے تہائی حصہ کا سامان کون کرے گا؟" حضرت عثمان ؓ اٹھے اور عرض کیا "یا رسول اللہ لشکر کے تہائی حصہ کا سامان میں کروں گا۔" حضور ؐ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا فرمایا "آج کے بعد عثمان جو چاہیں کریں ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔" حضرت عمر ؓ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر میرے گھر میں کچھ مال آیا تھا میں نے سوچا کہ آج موقعہ ہے کہ میں ابوبکر صدیق ؓ سے بازی لے جاؤں۔ چنانچہ میں نے گھر آ کر مال و اسباب کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا۔ آدھا مال گھر کی ضروریات کے لئے چھوڑ دیا اور آدھا حضور ؐ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ آپ نے پوچھا "عمر گھر کیا لائے؟" میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ نصف مال گھر چھوڑ آیا ہوں اور نصف اللہ کی راہ میں سے

آیا ہوں۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بھی اپنا سامان لے آپہنچے۔ حضورؐ نے ان سے بھی دریافت فرمایا کہ "اے ابوبکر کیا لاتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "اے اللہ کے رسول جو کچھ گھر میں تھا لے آیا ہوں اور گھر میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت چھوڑ آیا ہوں"۔ حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا کہ یہ ایک موقع تھا کہ میں ابوبکر صدیق رضؓ سے بازی لے جاتا مگر آج بھی میدان انہی کے ہاتھ رہا۔ یہ بھی ایک دوڑ ہے جو دو انسانوں کے درمیان جاری ہے۔ مگر یہ کتنی پاکیزہ اور دلربا دوڑ ہے۔

مگر ٹھہریے ابھی اس دوڑ کا آخری نقطہ نہیں آیا۔ اسی مدینہ میں ایک قلاش اور فاقہ زدہ مسلمان ابوعقیل انصاری رضؓ بھی موجود ہیں۔ مسجد نبوی میں مال و اسباب دیکھتے ہیں تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ دل سے حسرت کا دھواں اٹھتا ہے کہ میں نے اس نازک وقت میں اسلام کی کیا خدمت کی! ان کی طبیعت میں ایک اضطراب ہے جس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ دل میں ایک درد ہے مگر اس درد کا کوئی درماں سجھائی نہیں دیتا۔ گھر میں فاقہ ہے مگر انہیں گھر والوں کے فاقہ کی اتنی تشویش نہیں۔ انہیں اگر کوئی غم کھائے جا رہا ہے تو یہی کہ وہ امتحان کی کٹھن گھڑیوں میں نصرتِ اسلام میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے۔ اسی ادھیڑبن میں وہ اپنی قسمت پر فریاد کناں اپنے رب سے لو لگائے بیٹھے ہیں کہ یکایک ان کے دماغ میں ایک خیال نے راہ پائی۔ دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور آنکھوں میں امید کے چراغ روشن ہو گئے۔ تمام رات ایک یہودی کے باغ کو سینچا اور علی الصبح چند سیر کھجوریں مزدوری میں ملیں۔ ابوعقیل انصاری کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ انہوں نے آدھی کھجوریں گھر دے دیں اور آدھی کھجوریں پلو میں باندھ کر مسجد نبوی کی طرف بڑھے۔ مگر جب مسجد میں مال و متاع کا عظیم الشان ذخیرہ دیکھا تو اپنی متاعِ حقیر کے تصور سے پانی پانی ہو گئے۔ چاہا کہ نظریں بچا کر ان چند کھجوروں کو ایک کونہ میں گرا دیں کہ اچانک انہیں محبت میں ڈوبی ہوئی ایک آواز نے چونکا دیا۔ "ابوعقیل کیا لائے ہو؟" اگرچہ حضورؐ کی آواز میں شفقت رچی بسی تھی۔ مگر ابوعقیل رضؓ اپنی متاعِ حقیر کے تصور سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ شرم سے نگاہیں جھک گئیں اور عرض کیا "حضورؐ چند کھجوریں لایا ہوں"۔ رسولِ خدا کے روئے مبارک پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کھجوریں مبارک ہاتھوں میں لے کر مال و متاع کے ڈھیر پر پھیلا دیں اور فرمایا "ابوعقیل کا یہ عطیہ اللہ کی نظر میں اس سارے ساز و سامان سے زیادہ قیمتی ہے"۔ اور حضرت ابوعقیل انصاری رضؓ بازی جیت گئے۔

اُحد کی وادی میں میدانِ کارزار گرم ہونے والا ہے۔ حضورؐ یکایک ایک تلوار بلند کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "آج اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا؟" کتنے ہی ہاتھ اس تلوار کو پا لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ کتنے ہی دل اس تمنا سے مچلتے ہیں کہ آج یہ سعادت میرے حصہ میں آئے کیونکہ آج اس تلوار کو پا لینا دین و دنیا کی سعادت کو پا لینا ہے۔ یہ تلوار ظلم و جور اور شقاوت کی تلوار نہیں ہے بلکہ یہ تلوار حق کی پاسبان اور باطل کی کاٹ کی تلوار ہے۔ سیکڑوں نگاہیں اس تلوار میں اٹکی ہوئی ہیں۔ اتنے میں حضرت ابودجانہ رضؓ آگے بڑھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں "یا رسول اللہ اس تلوار کا حق

میں ادا کروں گا"۔ حضورؐ کمال شفقت سے تلوار انہیں تھما دیتے ہیں۔ حضرت ابودجانہ رضؓ اس سعادت پر نازکناں، اٹھلاتے، مچلتے، جھکتے، تنتے ایک ادا کی چال چلتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو یہ چال ناپسند ہے مگر اب اس حال میں پسند ہے"۔ کیونکہ یہ چال کبر و نخوت کی چال نہ تھی بلکہ راہِ خدا میں سبقت لے جانے پر جذب و شوق کی چال تھی جس پر فرشتے نثار اور قدسیاں رشک کناں تھے۔

کتنے ہی دنوں سے خیبر کے ناقابلِ تسخیر قلعہ پر حملوں کا سلسلہ جاری ہے مگر قلعہ بہت بلندی پر یوں سینہ تانے کھڑا ہے کہ گویا وہ اہلِ ایمان کے جوشِ ایمانی اور یقینِ محکم کا امتحان لے رہا ہے۔ ایک دن سرِ شام لسانِ رسالتؐ گویا ہوئی "کل اسے علَم دیا جائے گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا"۔ ادھر زبانِ مبارک سے الفاظ کے موتی بکھرے اُدھر دل محوِ دعا ہو گئے۔ رات بھر علَم کے چرچے ہیں۔ قیاس آرائیاں ہیں کہ دیکھیے صبح کس کی قسمت کا ستارہ چمکے۔ امید و بیم کی حالت میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ ہر دل میں ایک ہی تمنا ہے کہ علَم مجھے عطا ہو۔ کس لئے کہ علَم سرداری کا ذریعہ ہے یا دنیوی عروج کا زینہ ہے؟ نہیں نہیں بلکہ اس لئے کہ راہِ حق میں پیش قدمی کا روشن نشان ہے۔ حضرت عمر رضؓ تک چاہتے ہیں کہ علَم میرے حصہ میں آئے۔ مگر جب ہادی کی آواز فضاؤں میں گونجی کہ "علیؓ کہاں ہیں؟" تو دلوں میں کوئی حسد نہیں تھا۔ پیشانیوں میں نورِ ایمان کی تابانی تھی۔ چہرے وفورِ جذبات سے سرخ ہو رہے تھے اور آنکھیں محبت سے بھیگی جا رہی تھیں کہ آج کے دن حضرت علی رضؓ راہِ حق میں سبقت لے چکے تھے۔ حضرت علی رضؓ وفورِ جذبات سے آگے بڑھتے ہیں۔ نبیؐ کے مقدس ہاتھوں سے علَم لیتے ہیں اور صحابہؓ کی معیت میں حق و باطل کی وہ فیصلہ کن جنگ بپا کرتے ہیں کہ آخرکار قلعہ کا دروازہ وا کئے دیتے ہیں اور فاتحِ خیبر کہلاتے ہیں۔

ام المومنین عائشہ رضؓ ان گنت ستاروں پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ دفعتاً سطحِ دماغ پر ایک سوال ابھرتا ہے اور حضورؐ سے پوچھتی ہیں "اے اللہ کے رسولؐ بھلا کسی کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر بھی ہوں گی"۔ حضورؐ تبسم کناں فرماتے ہیں "ہاں عمر رضؓ بن خطاب کی نیکیاں"۔ ام المومنینؓ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں وہ جن کے نورِ فراست سے لاکھوں دلوں میں فراست کے چراغ جگمگائے وہ بھلا اس سوچ سے ناواقف تھے؟ ام المومنینؓ نے بے قرار ہو کر پوچھا "یا رسول اللہ میرے باپ کی نیکیاں"؟ فرمایا "عائشہؓ تمہارے باپ کی ایک رات (غارِ ثور) کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر ہیں"۔ ام المومنینؓ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا کیونکہ ان کے باپ حیاتِ ابدی کی دوڑ میں ابھی آگے تھے۔

عید کا دن ہے۔ ام المومنین عائشہ رضؓ کے حجرہ میں بچیاں دف بجا کر گا رہی ہیں۔ حضورؐ تشریف لائے۔ بچیاں اپنے شغل میں محو ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ آئے۔ گانے بجانے کا مشغلہ جاری ہے۔ ادھر حضرت عمر رضؓ کی

آواز ان کے کانوں میں آئی ادھر وہ دف چھوڑ گانا بھول ادھر اُدھر جا چھپیں۔ حضرت عمرؓ اجازت لے کر اندر آئے حضورؐ کو ہنستے ہوئے دیکھا تو عرض کیا "میرے ماں باپ قربان آپ کس چیز پر ہنس رہے ہیں۔" آپؐ نے بچیوں کی داستان کہہ سنائی تو حضرت عمرؓ کی پُر رعب آواز گونجی "اے اپنی جان کی دشمنو! رسول اللہ سے نہیں شرماتیں اور مجھ سے ڈرتی ہو؟" بچیاں جواب دیتی ہیں "آپ سخت مزاج ہیں اور حضورؐ نرم خو ہیں۔" حضورؐ ہنس کر فرماتے ہیں۔ "عمرؓ جس وادی میں قدم رکھتے ہیں وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔"

حضورؐ گھر میں لیٹے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حاضر ہوتے ہیں۔ آپ بدستور لیٹے رہتے ہیں۔ اتنے میں حضرت عثمانؓ اجازت طلب کرتے ہیں۔ آپ فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چادر ٹخنوں تک درست کرلیتے ہیں۔ جب تینوں اصحاب واپس لوٹ گئے تو ام المومنین حضرت عائشہؓ پوچھتی ہیں کہ "اے اللہ کے رسول جب ابوبکرؓ اور عمرؓ آئے تو آپ لیٹے رہے۔ مگر جب عثمانؓ آئے تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور چادر کو ٹخنوں تک درست کرلیا!" حضورؐ نے فرمایا "کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں!" حیا ایمان کا ایک عظیم شعبہ ہے اور اس شعبہ میں حضرت عثمانؓ کا عمل دوسروں کے لئے ایک قابل رشک نمونہ تھا۔

راہِ حق میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں کبھی کبھار صحابہ کرامؓ میں باہم چشمک بھی ہو جاتی تھی مگر اس میں بھی کسی حسد یا برائی کے جذبہ کا کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ اس راہ میں پیش قدمی سے سرور و نشاط کی جو کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ بسا اوقات اس کیفیت کا بے ساختہ اظہار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دن حضرت اسماءؓ بنت عمیس ام المومنین حضرت حفصہؓ کی ملاقات کے لئے آئیں وہ مہاجرین حبشہ میں سے تھیں جنہیں سفینہ والے اور حبشہ والے کہا جاتا تھا اتنے میں حضرت عمرؓ بھی اپنی بیٹی کے یہاں آگئے اور ان سے دریافت کیا کہ گھر میں اور کون ہے؟ حضرت اسماء نے سن کر جواب دیا کہ میں اسماء بنت عمیس ہوں۔ آپ بولے "اچھا حبشہ والی سفینہ والی" پھر کہا "ہم لوگ ہجرت میں تم سے سبقت لے گئے اور ہم رسول خداؐ کے تم لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں۔" حضرت اسماءؓ آپؓ کی اس بات سے ملول ہوگئیں اور بولیں "واللہ آپ لوگ حضورؐ کے ساتھ تھے۔ حضورؐ بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے جاہلوں کو تعلیم دیتے تھے اور ہم اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے حبشہ کی دور دراز سرزمین میں پڑے تھے اللہ کی قسم میں تو کھاؤں پیوں گی نہیں جب تک حضورؐ کے سامنے آپ کی بات بلا کم و کاست پیش نہ کردوں۔" اتنے میں حضورؐ تشریف لائے اور حضرت اسماءؓ نے آپ کے سامنے پوری بات دہرادی۔ آپؐ نے فرمایا "عمرؓ اور اس کے ساتھی آپ لوگوں سے زیادہ مجھ پر حق نہیں رکھتے کیونکہ انہوں نے ایک بار ہجرت کی ہے اور آپ لوگوں نے دو بار ہجرت کی ہے۔" حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر حضرت اسماءؓ باغ باغ ہوگئیں اور مہاجرین حبشہ کا تو یہ حال تھا کہ وہ جوق در جوق حضرت اسماءؓ کے پاس آرہے تھے تاکہ وہ من وعن ان کلمات کو اپنے کانوں سے سنیں کہ جنہوں نے

مہاجرین مدینہ پر انہیں فضیلت عطا کر دی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں مدینہ کے اس ماحول میں سبقت لے جانے والوں سے کسی کو کوئی حسد نہ تھا بلکہ رشک کے وزے دلوں میں ایک تابانی تھی جو انہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے پر ابھارتی تھی جسے راہ حق میں سبقت کی نوید مل گئی۔ اس کی رفتار تیز تر ہو جاتی کہ کہیں دوسرے اس سے آگے نہ بڑھ جائیں۔ نیز اس ابدی کامیابی پر اگر وہ سرور و نشاط کی کیفیت میں کھو جاتیں اور رضائے الٰہی کی نوید پاکر اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں تو یہ عین تقاضائے فطرت ہے چنانچہ حضرت سعدؓ بن وقاص بیان کرتے ہیں کہ "میدان احد میں رسول خداؐ میری اوٹ میں تھے اور مجھے تیر پکڑا کر فرماتے تھے "اے سعد تم پر میرے ماں باپ قربان اس طرف تیر پھینکو!" اور پھر حضرت سعدؓ کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور خوشی کے نشہ میں جھوم کر فرماتے "حضورؐ نے یہ الفاظ میرے سوا اور کسی کے لئے استعمال نہیں کئے!" فی الحقیقت راہ محبت میں حضرت سعدؓ کی یہ ایسی کامیابی تھی کہ جس پر فرشتے بھی رشک کرتے تو بجا ہوتا۔

پھر مدینہ کی اس سوسائٹی میں کسی کو کسی کی فضیلت کے اعتراف میں کوئی بخل نہ تھا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ابوبکرؓ ہم میں سب سے زیادہ شجاع ہیں کہ انہوں نے بدر میں حضورؐ کے خیمہ پر پہرہ کی ذمہ داری قبول کی حالانکہ کوئی دوسرا اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔

ایک شخص کی منزل مقصود اگر دولت جمع کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر تو دولت جمع نہیں کرسکتا بلکہ وہ تو اپنی جان کو کانٹے کی چبھن سے بھی بچائے گا تاکہ وہ اپنی جمع کی ہوئی دولت سے آنکھوں کو ٹھنڈا کر سکے دولت مند کہلائے اور داد عیش دے۔ اسی طرح اقتدار کا طالب بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کی جان بھی بچ جائے اور اقتدار بھی حاصل ہو جائے تاکہ وہ صاحب اقتدار بن کر زندگی کے مزے لوٹے اور انا ولا غیری کا ڈنکا بجائے۔ مگر ایک مومن کا معاملہ ان سب سے جدا ہے اس کی منزل مقصود رضا ہے اگر اسے یقین ہو جائے کہ وہ مال لٹا کر اور جان دے کر اللہ تعالیٰ کی رضا کو پالے گا تو اسے جان و مال کی بازی لگا دینے میں بھی کوئی باک نہ ہوگا بلکہ وہ تو جان دے کر بھی کہے گا ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ قرن اول کے مرد مومن کو جب بھی یہ نوید ملی کہ وہ جان دے کر اللہ کی رضا کو پالے گا تو اس نے بلا ادنیٰ توقف جان کی بازی لگا دی۔ دیکھئے حضرت وہبؓ بن قابوس احد کے میدان میں تلوار لئے ہیں کہ اتنے میں کفار کا سیلاب حضورؐ کی طرف بڑھا۔ آپ نے فرمایا "جو ان کو منتشر کردے گا وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا" حضرت وہبؓ مردانہ وار آگے بڑھے اور کفار کے چھکے چھڑا دیئے اتنے میں کفار کا دوسرا دستہ ذات اقدسؐ پر حملے کے لئے آگے بڑھا حضورؐ نے فرمایا "جو انہیں تتر بتر کردے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔" حضرت وہبؓ بپھرے ہوئے شیر کی

طرح آگے بڑھے اور کفار کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ اتنے میں دشمن کا تیر اُدھر رسولِ خدا ؐ پر حملہ کے لئے جھپٹا۔ آپ نے فرمایا "جو ان کو مار بھگائے وہ جنت میں میرا ہمراہی ہوگا۔ حضرت وہبؓ پھر شاہین کی طرح جھپٹے اور دشمنوں کو مار بھگایا اور خود بھی شہادت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت سعد بن وقاص کہتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی کو وہبؓ جیسی سرفروشی کا مظاہرہ کرتے نہیں دیکھا۔ حضور ؐ جنگ کے بعد سخت زخمی ہونے کے باوجود حضرت وہب رضؓ کے سرہانے کھڑے تھے اور فرماتے تھے۔ "وہب رضؓ اللہ تم سے راضی ہو میں تم سے راضی ہوں" حضرت عمر فاروق کہتے ہیں کہ مجھے زندگی میں کسی کے عمل پر اتنا رشک نہیں آیا جتنا وہبؓ کے عمل پر آیا۔ کاش میں بھی اللہ کے ہاں وہبؓ جیسا عمل لے کر جاؤں۔

اسی میدانِ احد میں جنگ سے پہلے دو مجاہد مصروفِ دعا ہیں۔ ایک دعا کرتا ہے اور دوسرا اس دعا پر اللہ تعالیٰ سے شرفِ قبولیت بخشنے کی استدعا کرتا ہے اور دونوں کو اپنی دعا کی قبولیت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اور اخلاص کی دولت موجود ہے۔ پہلے حضرت سعد رضؓ بن ابی وقاص دعا کرتے ہیں کہ "اے میرے معبود کل میدانِ جنگ میں میرا ایک قوی اور بہادر شخص سے مقابلہ ہو پھر میں اس پر فتح پاؤں اور مالِ غنیمت حاصل کروں۔ حضرت عبداللہ رضؓ نے بارگاہِ الٰہی میں اس دعا پر عرض کی "اے اللہ میرے ساتھی کی دعا قبول فرما۔" پھر حضرت عبداللہ رضؓ بن جحش کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے کہ "اے میرے خدا! میرا بھی ایک زور آور دشمن سے مقابلہ ہو ہمارے درمیان گھمسان کا رن پڑے پھر میرا دشمن مجھے قتل کر دے میرے ناک کان کاٹ ڈالے اور جب قیامت کے دن میں تیرے دربار میں آؤں تو تو سوال کرے کہ اے عبداللہ تیرے ناک کان کیا ہوئے! تو میں عرض کروں کہ "تیرے اور تیرے رسول ؐ کی راہ میں کاٹ ڈالے گئے" اور پھر تو فرمائے اے عبداللہ تو نے سچ کہا" اس پر حضرت سعد نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی "اے میرے معبود میرے ساتھی کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا کر" پھر دونوں کی دعا حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضرت سعد رضؓ اپنے دشمن پر غالب رہے اور حضرت عبداللہؓ اس طرح میدان میں لڑے کہ لڑتے لڑتے ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ پھر دشمنوں نے انہیں شہید کرکے ان کی لاش کا مثلہ کر دیا۔ اس کے بعد حضرت سعد رضؓ برملا اعتراف کیا کرتے تھے کہ "بلاشبہ عبداللہ رضؓ کی دعا میری دعا سے کہیں بہتر تھی"

حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضؓ تبوک کے سفر میں حضور ؐ سے عرض کرتے ہیں "یا رسول اللہ آپ میرے لئے شہادت کی دعا فرمائیں" آپ انہیں شہادت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ حضرت عبداللہ مقام تبوک پر پہنچ کر بیمار ہوئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ صحابہ رضؓ نے قبر کھودی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ ان کے جسمِ اطہر کو ہاتھوں میں لئے قبر میں اتار رہے ہیں۔ حضور ؐ فرماتے ہیں "اپنے بھائی کو احترام سے میری طرف

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

فلسفۂ اقبال

[علامہ اقبال مرحوم بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کے فلسفہ کو عام طور پر "فلسفۂ خودی" کا نام دیا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ ان کا اصل فلسفہ ہے کیا!

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ علامہ کی معرکۃ الآرا مثنوی "اسرارِ خودی" کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا ہے۔ لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ پروفیسر موصوف نے خود "اسرارِ خودی" کو سمجھنے کے لئے اوّلاً ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم سے مدد لی جو اس وقت کیمبرج میں اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے (یہ ذکر ۱۹۱۸ء کا ہے) اور پھر جب اس ساری تگ و دو کے باوجود وہ علامہ مرحوم کے فلسفہ کو اچھی طرح نہ سمجھ پائے تو انہوں نے خود علامہ سے رجوع کیا اور فرمائش کی کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبان انگریزی تحریر کر دیں۔ علامہ نے اس فرمائش کی تعمیل میں جو مضمون لکھا اسے پروفیسر نکلسن نے "SECRETS OF THE SELF" کے شروع میں شامل بھی کر دیا جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذیل میں ایک تو اس تحریر کا وہ ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر چشتی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں کیا تھا اور دوسرے مثنوی اسرارِ خودی کا وہ خلاصہ بھی درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں خود مرتب کیا تھا۔

اس طرح یہ مضمون علامہ اقبال مرحوم کے فلسفے پر نہایت مختصر لیکن انتہائی جامع اور ساتھ ہی نہایت درجہ عام فہم دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا انداز تمام تر سرو حقی ہے اور اس کے ذریعے علامہ مرحوم کے فلسفہ کو جیسا کچھ وہ ہے پیش

کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔۔۔ اس لئے اس میں کسی جگہ بھی اختلاف یا اتفاق کا اظہار نہیں کیا گیا ۔۔۔۔۔۔ !! آئندہ شمارے میں انشاء اللہ "رموزِ بے خودی" کا خلاصہ بھی شائع کر دیا جائے گا یہ بھی پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں مرتب کیا تھا۔ اس طرح اس پیغام کا خلاصہ بھی سامنے آجائے گا جو علامہ مرحوم نے امتِ مسلمہ کو دیا تھا اور یہ تینوں مضمون مل کر ایک کل وحدت کی صورت اختیار کریں گے ۔۔۔۔۔۔ واضح رہے کہ رموزِ بے خودی کا ترجمہ بعد میں پروفیسر آربری نے کیا جو ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ۔۔۔۔۔۔ "اسرار احمد"]

—— (۱) ——

اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ

جو انہوں نے نکلسن کی فرمائش پر خود تحریر فرمایا

ترجمہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ خود خدا بھی اک فرد ہے۔ اگرچہ فردِ کامل ہے۔ کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بدنظمی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ افرادِ کائنات کی تعداد معین نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات فعلِ مختتم نہیں ہے۔ ہنوز مراتبِ تکمیل طے کر رہی ہے اسی لئے اس کے متعلق کوئی بات حتمی اور اذعانی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ فعلِ تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے اس حد تک اس کو بھی فعلِ تخلیق میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ "فتبارک اللہ احسن الخالقین"

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور اربابِ وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹا دے۔

میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے "تخلقوا باخلاق اللہ" یعنی اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو۔ پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہوگا، اسی قدر اس کے اندر شانِ یکتائی اور رنگِ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے خودی (EGO) ہے۔ اگرچہ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے۔ لیکن ابھی تک فردِ کامل کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ فرد جس قدر خدا سے قریب ہوگا، اسی قدر کامل ہوگا۔ قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے، بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلے۔ حیات دراصل اک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان پر غلبہ پاکر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاصہ یا جوہرِ طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی حفاظت اور ترقی کے لئے اس نے آلات اور وسائل پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً حواس اور ادراک جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتی ہے۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن مادہ کوئی بری چیز نہیں بلکہ حیات کے حق میں مفید ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

جب حیات یا خودی مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے خودی ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے "الایمان بین الجبر والاختیار" حیات جب تقربِ الٰہی حاصل کرلیتی ہے تو اختیار کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے مختصر یہ کہ حیات یا خودی، مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار تک پہنچنے کا نام ہے۔

جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کرلیتی ہے تو اس کا نام ایغو یا شخص یا خودی ہو جاتا ہے اور شخصیت جد و جہد کی مسلسل حالت سے عبارت ہے۔ شخصیت کا قیام اسی حالت کے تسلسل پر منحصر ہے اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطل یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی اور یہ بات خودی کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ شخصیت (PERSONALITY) چونکہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لئے اس کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ اس جوہرِ بے بہا کو مسلسل سرگرمِ عمل رکھے اور وہ عمل ایسا ہو کہ خودی کی ترقی کا باعث ہو۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "عملِ صالح" کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔

مسلسل جد و جہد ہی زندگی ہے (چہ دوام ما زسوز نا تمام است) جو شے شخصیت کو پیہم جد و جہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے اس لئے حسن یا اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو ضعیف یا معطل کرے وہ بُری ہے۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیئے۔

"PERSONALITY IS THE CRITERION OF VALUE"

میں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیئے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے۔ اس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبہ اختیار پر فائز کرنے کے لئے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے، اُسی طرح اُسے غیر فانی بنانے کے لئے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبہ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لئے جد و جہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار و اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالتِ کاوشِ پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوف اس حالت کے لئے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالتِ کاوش برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالم برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدمہ صرف وہ افراد برداشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو پختہ کر لیا ہوگا۔

اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ ولڈن کار نے لکھا ہے حشر اجساد بھی عین قرین عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لئے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقید بالمکان زمانہ، اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لئے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم غیر زمانی ہیں۔ اور

موجودہ مقید بالزمان زندگی میں بھی۔ کبھی کبھی ہمیں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل "آنی" ہوگا۔

خودی میں عشق سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شان انفرادیت پیدا کر دیتا ہے۔

جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات ہمیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے، وہ بھی سائل ہے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے ‏ ‏ ‏ مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لئے آنحضرت صلعم کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" آپؐ نے اپنے طرز عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامانِ اوست ‏ ‏ ‏ بحر و بر در گوشۂ سامانِ اوست

تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستورِ الٰہی کی اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی

نیابتِ الٰہی، دنیا میں انسانی ارتقاء کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منتہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں آکر حیات اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور عمل، جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لئے وہ تمام مصیبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برمحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں۔ لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانہ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابتِ الٰہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہ معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

'اسرار خودی'

کے مباحث عالیہ کا مختصر خاکہ

مرتبہ : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے۔ لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لئے اسرار خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱) شاعری علامہ کے لئے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعہ اظہار خیالات ہے۔ لکھتے ہیں :

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست   بت پرستی بت گری مقصود نیست [1]

پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عروضی قواعد پر پرکھتے ہیں، حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں "پیغام گو" ہے۔

(۲) خودی اصل نظام عالم ہے اور تسلسل حیات استحکام خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" موجود ہے۔

چوں حیات عالم از زور خودی است   پس بقدر استواری زندگی است [2]

قطرہ چوں حرف خودی از بر کند   ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند [3]

---

[1] اس مثنوی سے شاعری مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی بت پرستی یا بت گری مقصود ہے۔

[2] چونکہ عالم کی حیات زور خودی پر موقوف ہے اس لئے زندگی بقدر استواری ہے۔

[3] جب قطرہ خودی کا سبق حفظ یاد کر لیتا ہے تو اپنی بے قیمت ہستی کو موتی میں تبدیل کر لیتا ہے۔

(۳) خودی کی حیات و بقا، تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصل او در آرزو پوشیدہ است [1]

دل ز سوز آرزو گیرد حیات   غیر حق میرد چو او گیرد حیات [2]

زندہ را نفیٔ تمنا مردہ کرد   شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد [3]

علم از سامان حفظ زندگی است   علم از اسباب تقویم خودی است [4]

(۴) خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔

از محبت می شود پایندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر [5]

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست   اصل او از آب و باد و خاک نیست [6]

خاک نجد از فیض او چالاک شد   آمد اندر وجد و بر افلاک شد [7]

(۵) عشق کا طریقہ محمد عربیؐ سے سیکھنا چاہیئے۔

در دل مسلم مقام مصطفےٰؐ است   آبروے ما ز نام مصطفےٰؐ است [8]

آنکہ بر اعدا در رحمت کشاد   مکہ را پیغام لا تثریب داد [9]

امتیازات نسب را پاک سوخت   آتش او این خس و خاشاک سوخت [10]

---

[1] زندگی تو جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔

[2] دل سوز آرزو سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب وہ زندگی حاصل کرتا ہے تو غیر حق فنا ہو جاتا ہے۔

[3] زندہ انسان کو تمنا کی نفی مردہ کر دیتی ہے (جس طرح) اگر شعلے میں سوز کم ہو جائے تو وہ (آخر کار) افسردہ ہو جاتا ہے۔

[4] علم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت کا سامان مہیا کرے اور خودی کی تقویم (پائداری) کے اسباب فراہم کرے۔

[5] خودی محبت سے پائندہ تر، زندہ تر، سوزندہ تر اور تابندہ تر ہو جاتی ہے۔

[6] عشق کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ اس کی اصل مادی نہیں ہے۔

[7] عشق کی بدولت نجد کی خاک چالاک ہو گئی۔ وجد میں آ گئی اور آسمان کے اوپر چلی گئی۔

[8] مصطفےٰؐ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہماری آبرو مصطفےٰؐ ہی کے نام سے ہے۔

[9] جنہوں نے دشمنوں پر رحمت کا دروازہ کھولا اور مکے کو لا تثریب [11] کا پیغام دیا۔

[10] انہوں نے نسب کے امتیازات کو بالکل فنا کر دیا ان کی تعلیم نے اس خس و خاشاک کو بھسم کر دیا۔

[11] آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا (مؤلف)

چوں گل صد برگ ما را بو یکیست　　اوست جان این نظام و او یکیست[1]

(۶) بغیر آپؐ کی اتباع کے، خودی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو کند یزداں شکار[2]

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا　　شرح انی جاعل سازد ترا[3]

(۷) خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ　　الحذر از منت غیر الحذر[4]

رزق خویش از نعمت دیگر مجو　　موج آب از چشمۂ خاور مجو[5]

تا نباشی پیش پیغمبر خجل　　روز فردائے کہ باشد جاں گسل[6]

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز　　آبروئے ملت بیضا مریز[7]

(۸) جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظام عالم کو مسخر کر لیتی ہے۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود　　ماہ از انگشت او شق می شود[8]

در خصومات جہاں گردد حکم　　تابع فرمان او دارا و جم[9]

(۹) مسئلۂ نفی خودی اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوام غالبہ کے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں اس لئے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔

---

[1] گل صد برگ کی طرح ہماری خوشبو بھی ایک ہی ہے۔ وہی (ص) اس نظام کی جان ہیں اور وہ ایک ہیں۔

[2] کیا تو عشق رسولؐ کا مدعی ہے؟ اگر ہے تو پھر محبوب کی تقلید کر کے محکم ہو جا۔ تاکہ تیری کمند یزداں کو شکار (گرفتار) کر سکے۔

[3] تاکہ خدائے کعبہ تجھ پر نوازش فرمائے اور تجھے "انی جاعل" کی شرح بنا دے۔ یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام پر فائز فرما دے۔

[4] حضرت عمرؓ کی طرح اونٹ سے خود نیچے اتر۔ غیر کا احسان اٹھانے سے سو بار اللہ کی پناہ۔

[5] اپنا رزق دوسرے کے دستر خوان سے مت ڈھونڈ۔ آفتاب کے چشمے سے پانی کی موج مت مانگ۔

[6/7] تاکہ تو پیغمبر کے سامنے اُس دن شرمندہ نہ ہو جو بہت روح فرسا ہوگا اس لئے اللہ سے ہمت طلب کر اور دنیا کا مقابلہ کر۔ دست سوال دراز کر کے ملت بیضا کی آبرو زائل مت کر۔

[8] اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور چاند اس کی انگلی کے اشارے سے پھٹ جاتا ہے۔

[9] وہ خصومات جہاں میں حکم (پنچ) بن جاتا ہے اور شاہان عالم اس کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی　　کوتہ دستی بے دلی دوں ہمتی[10]

(۱۰) افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترک عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لئے مضر ہے۔

بسکہ از ذوق عمل محروم بود　　جان او وارفتۂ معدوم بود[11]

منکر ہنگامۂ موجود گشت　　خالق اعیان نامشہود گشت[12]

قومہا از سکر او مسموم گشت　　خفت و از ذوق عمل محروم گشت[13]

(۱۱) ادبیات اسلامیہ بھی مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں۔ شعراء اور ادباء کو چاہیئے کہ ایسے مضامین سپرد قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میان کیسہ ات نقد سخن　　بر عیار زندگی او را بزن[14]

فکر روشن بیں عمل را رہبر است　　چوں درخش برق پیش از تندر است[15]

فکر صالح در ادب می بایدت　　رجعتے سوئے عرب می بایدت[16]

(۱۲) تربیت خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہیہ۔

(ا) اطاعت

در اطاعت کوشش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار[17]

باطن ہر شے ز آئینے قوی　　تو چرا غافل ازیں ساماں روی[18]

---

[10] بے ہمتی سے صدہا امراض پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً کوتاہ دستی، بے دلی اور دوں ہمتی۔

[11/12] چونکہ وہ (افلاطون) ذوق عمل سے محروم تھا اور اس کی جان وارفتۂ معدوم تھی اس لئے وہ موجودہ ہنگامے (کائنات خارجی) کا منکر ہو گیا اور اعیان نامشہود کا خالق بن گیا۔

[13] بہت سی قومیں اس کی شراب سے مسموم ہو گئیں اور سو گئیں اور اس لئے ذوق عمل سے محروم ہو گئیں۔

[14] اے وہ شخص کہ تیری تھیلی میں شاعری کی نقدی ہے۔ اس شاعری کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھ (کہ یہ شاعری سچی ہے یا کھوٹی)

[15] فکر روشن بیں عمل کی طرف رہنما ہوتی ہے جس طرح بجلی کی چمک کڑک سے پہلے ہوتی ہے (اور اس کی طرف رہنما ہوتی ہے)

[16] تجھے لازم ہے کہ ادب میں فکر صالح سے کام لے اور اس کے لئے تجھے عربی شاعری کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔

[17] اے غفلت شعار! اطاعت الٰہی کی کوشش کر۔ اختیار، جبر (اطاعت) سے پیدا ہو سکتا ہے۔

[18] ہر شے کا باطن قانون ہی سے قوی ہوتا ہے تو اس سامان سے کیوں غافل ہے؟

شکوہ سنج سختی آئین مشو … از حدود مصطفٰے بیروں مرو[1]

(ب) ضبط نفس

ہر کہ بر خود نیست فرمانش روان … می شود فرماں پذیر از دیگراں[2]

تا عصائے لا الٰہ داری بدست … ہر طلسم خوف را خواہی شکست[3]

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد … فارغ از بند زن و اولاد شد[4]

می کند از ما سوا قطع نظر … می نہد سا طور بر حلق پسر[5]

(ج) نیابت الٰہی

نائب حق ہمچو جان عالم است … ہستی او ظل اسم اعظم است[6]

از رموز جزو و کل آگہ بود … در جہاں قائم بامر اللہ بود[7]

نوع انساں را بشیر و ہم نذیر … ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر[8]

مدعائے علم الاسما ستے … سر سبحان الذی اسرا ستے[9]

ذات او توجیہ ذات عالم است … از جلال او نجات عالم است[10]

(۱۳) حیات ملی کا تسلسل، روایات ملیہ کی حفاظت و مداومت پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنی ملی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات پر قائم رہنا چاہیئے۔

---

[1] آئین کی شدت کا شکوہ مت کر اور شریعت کی حدود سے باہر مت نکل۔

[2] جو شخص خود اپنے نفس پر حکمران نہیں ہے وہ ضرور دوسرے کا محکوم بن جاتا ہے۔

[3] جب تک لا الٰہ کا عصا تیرے ہاتھ میں ہے تو خوف کے ہر طلسم کو باطل کرتا رہے گا۔

[4] جو شخص بھی اقلیم لا میں آباد ہو گیا وہ عورت اور اولاد دونوں کی قید سے آزاد ہو گیا۔

[5] وہ ماسوائے اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے (اور) اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔

[6] نائب حق تو عالم کی روح کی مانند ہوتا ہے اس کی ہستی (دراصل) اسم اعظم کا ظل ہوتی ہے۔

[7] وہ جزو اور کل (انسان اور خدا) کے رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس جہان میں قائم ہوتا ہے۔

[8] وہ نوع انسانی کے لئے بشیر و نذیر ہوتا ہے وہ سپاہی بھی ہوتا ہے سپہ گر بھی ہوتا ہے اور امیر (سپہ سالار) بھی ہوتا ہے

[9] وہ علم الاسما کا مدعا اور مقصود ہوتا ہے اور سبحان الذی اسریٰ کا بھید ہوتا ہے۔

[10] اس کی ذات، ذات عالم کی تشریح ہوتی ہے اور اس کے جلال سے عالم کی نجات وابستہ ہوتی ہے۔

اے امانت دار تہذیب کہن … پشت پا بر مسلک آبا مزن[1]

(۱۴) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصود اگر تسخیر ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبع مسلم از محبت قاہر است … مسلم ار عاشق نباشد کافر است[2]

تابع حق دیدنش نا دیدنش … خوردنش نوشیدنش خوابیدنش[3]

قرب حق از ہر عمل مقصود دار … تا ز تو گردد جلالش آشکار[4]

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید … تیغ او بر سینۂ او آرمید[5]

زندگی از طوف دیگر رستن است … خویش را بیت الحرم دانستن است[6]

(۱۵) موجودہ عقل و خرد اور تہذیب دراصل جہالت اور سفاہت ہے۔ مسلمانوں کو اس مادی تمدن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیئے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لئے کمزور ہے۔

علم مسلم کامل از سوز دل است … معنی اسلام ترک آفل است[7]

سوز عشق از دانش حاضر مجوے … کیف حق از جام ایں کافر مجوے[8]

دانش حاضر حجاب اکبر است … بت فروش و بت پرست و بتگر است[9]

(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمراں ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ چنانچہ مرشد رومی کہتے ہیں۔

---

[1] اے تہذیب کہن کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک سے منحرف نہ ہو۔

[2] مسلمان کی طبیعت محبت کی بدولت قاہر ہے اور مسلمان اگر عاشق نہیں ہے تو کافر ہے۔

[3] اس کا دیکھنا اور نہ دیکھنا تابع احکام حق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا کھانا پینا اور سونا بھی۔

[4] اپنے ہر عمل سے قرب حق مقصود رکھ تاکہ تیری ذات سے اس کا جلال آشکار ہو۔

[5] جو شخص غیر اللہ کی خاطر تلوار کھینچتا ہے (جنگ کرتا ہے) دراصل وہ اپنی تلوار اپنے ہی سینے میں پیوست کرتا ہے۔

[6] زندگی تو دوسروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا نام ہے اور اپنے آپ کو بیت الحرم (کعبہ) سمجھنے کا نام ہے۔

[7] مسلمان کا علم سوز دل سے کامل ہوتا ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں آفل کو ترک کر دینا۔

[8] دانش حاضر سے سوز عشق مت طلب کرو۔ حق کی کیفیت اس کافر کے جام سے مت مانگو۔

[9] دانش حاضر تو حجاب اکبر ہے۔ بت فروش، بت پرست اور بت تراش ہے۔

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را　　او ست سید جملہ موجودات را[1]

امام شافعیؒ نے وقت کو سیف قاطع قرار دیا ہے۔ وقت دراصل حیات ہے اور کوئی شخص حیات کو وقت سے جدا کرکے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم سرّ ایں شمشیر چیست　　آب او سرمایہ دار از زندگیست[2]
پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود　　قوت او از ہمیں شمشیر بود[3]
تو کہ از اصل زماں آگہ نۂ　　از حیات جاوداں آگہ نۂ[4]
زندگی از دہر و دہر از زندگیست　　لاتسبّوا الدہر فرمان نبیؐ است[5]
نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت　　غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت[6]

(۱۷) آخر میں علامہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ:-

(الف) عشق را از شغلِ لا آگاہ کن　　آشنائے رمزِ الا اللہ کن[7]

(ب) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے۔ یعنی محفل تو ہے مگر لیلیٰ نہیں۔ میں مثلِ شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدا یا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے ایک ہمدم عطا کر۔

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے　　از رموزِ فطرتِ من محرمے[8]
تا بجان او سپارم ہوئے خویش　　باز بینم در دل او روئے خویش[9]　　(ختم شد)

---

[1] جو اللہ تعالیٰ کے جمال کا عاشق ہے وہی تمام کائنات کا سردار ہے۔

[2] میں کیا بتاؤں کہ اس شمشیر کا راز کیا ہے؟ اس کی آب زندگی سے اپنا سرمایہ (اپنا وجود) حاصل کرتی ہے۔

[3] حیدر کا ہاتھ جو کہ خیبر گیر تھا۔ اس کی قوت اسی تلوار سے تھی۔

[4] تو کہ زمان کی اصل سے آگاہ نہیں ہے (اس لئے) حیاتِ جاوداں سے آگاہ نہیں ہے۔

[5] زندگی دہر (زمان) سے ہے اور دہر زندگی سے ہے (اسی لئے نبیؐ کا فرمان یہ ہے کہ لَا تَسُبُّوا الدہر یعنی دہر کو برا مت کہو۔

[6] سازِ وقت نغمۂ خاموش رکھتا ہے اور اگر تو زمان کے راز سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے دل میں غوطہ لگا۔

[7] عشق کو شغلِ لا سے آگاہ کر اور الا اللہ کے رمز سے آشنا کر۔

[8] میں تو تیرے لطف وکرم سے ایک ہمدم کا طالب ہوں جو میری فطرت کے رموز سے آگاہ ہو۔

[9] تاکہ میں اپنا سوز اس کے دل میں منتقل کرسکوں اور پھر اس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

تاریخ تصوفِ اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ

سوانح حیات

پورا نام ابوالقاسم الجنید ابن محمد ابن الجنید الخزاز القواریری ہے۔ آباؤ اجداد نہاوند کے باشندے تھے۔ لیکن ان کے والدین نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی اور حضرت جنیدؒ غالباً ۲۱۵ھ میں اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے بیس سال کی عمر تک دینی علوم حاصل کئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ اس زمانے میں حارث المحاسبیؒ بغداد میں شیخ المشائخ اور مرجعِ صوفیہ تھے۔ چنانچہ جنید نے انہی کی صحبت اختیار کی اور دس سال تک استفادہ کیا۔

جنید کہتے ہیں کہ ایک دن میرے ماموں حضرت سری سقطیؒ نے مجھ سے پوچھا "آجکل کس کی مجلس میں بیٹھتے ہو؟" میں نے حضرت حارث المحاسبی کا نام لیا تو کہنے لگے "ان سے علم تصوف تو ضرور حاصل کرو مگر ان کے عقلی علوم اور ان مباحثِ کلامیہ سے اجتناب کرنا جو وہ معتزلہ کے رد میں اپنے شاگردوں کو سکھاتے ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں ایسا محدّث بنائے جو علم تصوف سے بھی آگاہ ہو نہ کہ ایسا صوفی جو علم حدیث سے بھی آشنا ہو۔

جنید نے ساری عمر اپنے ماموں کی نصیحت کو مدّنظر رکھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں "میں نے پہلے حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ اس کے بعد المحاسبی کی صحبت اختیار کی اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔ کیونکہ علم تصوف کو قرآن اور سنت کے تابع رہنا چاہیئے۔ جس شخص نے تصوف سے پہلے قرآن حفظ نہ کیا ہو اور حدیث میں سند حاصل نہ کی ہو۔ اسے دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں ہے" (قوت القلوب جلد دوم صفحہ ۳۵)

جنیدؒ کی یہی خصوصیت ہے جس نے انہیں سید الطائفہ بنا دیا اور اسی نے صوفیا اور علماء دونوں نے انہیں اپنا مقتدا تسلیم کیا۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ایک ہمعصر معتزلی ابوالقاسم الکعبی نے ایک مجلس میں یہ کہا کہ "میں نے بغداد میں ایک ایسا شیخ طریقت دیکھا ہے جس کی نظیر میری نظر سے کہیں نہیں گزری۔ ادباء اس سے علم لغت حاصل کرتے ہیں۔ انشا پرداز اس سے طرز نگارش سیکھتے ہیں۔ فلاسفہ اس کے افکار سے مستفید ہوتے ہیں۔

شعراء اس سے فنِ شاعری کے محاسن حاصل کرتے ہیں، علماء اس سے نکاتِ علمیہ اخذ کرتے ہیں اور ان باتوں پر مستزاد یہ ہے کہ اس کی گفتگو سامعین کے ذہن اور علم سے بلند ہوتی ہے۔" جنید نے ۲۹۸ھ میں بغداد ہی میں وفات پائی۔

جنیدؒ کے صوفی اساتذہ

جنید خود کہتے ہیں "میں نے جب اپنے ماموں حضرت سری سقطیؒ کے گھر میں ہوش سنبھالا تو اسی وقت سے تصوف کی باتیں میرے کانوں میں پڑنے لگیں۔ میں جب سات برس کا تھا تو ایک دن چند صوفی میرے ماموں کے پاس بیٹھے شکر کے موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ میں صحن میں کھیل رہا تھا۔ ماموں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "تم بتا سکتے ہو کہ خدا کا شکر ادا کرنے کا مطلب کیا ہے؟" میں نے جواب دیا "شکر اسے کہتے ہیں کہ انسان اس خدا کی نافرمانی نہ کرے جو اسے ہر قسم کی نعمتیں عطا فرماتا ہے جو شخص نافرمان ہے وہ ناشکرا ہے۔" یہ جواب سن کر میرے ماموں نے کہا "اے بیٹے میں دعا کرتا ہوں کہ تمہاری زبان تمہارے لئے خدا کی نعمت بن جائے۔" (رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۱) بہرحال حضرت سری سقطی علم تصوف میں جنید کے پہلے شیخ ہیں۔

معروف کرخی | حضرت معروف کرخی جو سری سقطی کے شیخ ہیں، جنید کے دوسرے استاد تھے جن کی صحبت میں جنید نے تصوف کے رموز و نکات حاصل کئے۔

محاسبی | محاسبیؒ ان کے تیسرے شیخ صحبت تھے جو سری سقطی کے دوست تھے اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ان سے جنید نے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔

قصاب | ابوجعفر محمد ابن علی القصابؒ جنید کے چوتھے استاد ہیں۔ یہ عراقی صوفیوں کے شیخ تھے انہوں نے ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔ جنید نے ان سے تصوف کے رموز حاصل کئے۔

ابن الکرینی | یہ جنید کے پانچویں استاد ہیں۔ زہد و اتقاء میں بلند مقام پر فائز تھے۔

القنطری | یہ جنید کے چھٹے استاد ہیں ان کا پورا نام شیخ ابوبکر محمد ابن مسلم عبدالرحمٰن القنطری ہے۔ یہ بزرگ معروف کرخی اور بشر ابن حارث الحافی کے ہم جلیس تھے۔ جنید اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک دن ٹھیک دوپہر کے وقت جنید ان سے ملنے گئے تو انہوں نے کہا "تمہیں کوئی کام نہیں ہے جو اس وقت آئے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "اگر آپ سے ملاقات کوئی کام نہیں ہے تو پھر اور کام کسے کہتے ہیں؟ اس سے بڑھ کر کام کیا ہو سکتا ہے؟"

الحدّاد | ان کا پورا نام ابوحفص عمرو بن سلمیٰ الحدّاد النیساپوری ہے۔ یہ خراسان کے صوفیوں کے شیخ تھے۔ عقائد کے لحاظ سے معتزلی تھے اور علم کلام میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ابن ندیم نے فہرست میں لکھا ہے کہ ابوحفص الحداد کی ایک تصنیف کتاب البروت فی نکاۃ فوج الاولہ" کا ردّ کئی معتزلی علماء مثلاً ابوعلی الجبائی، الخیاط اور الحارث الوراق نے لکھا تھا۔ الخیاط نے اپنی تصنیف کتاب الانتصار میں انہیں رافضی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نظریۂ قِدَمِ الاشیاء کے قائل تھے حالانکہ کوئی معتزلی اس بات کا قائل نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

لیکن معتزلہ سے اس مابعد الطبیعیاتی مسئلہ میں اختلاف کے علاوہ ابوحفص الحداد صوفی بھی تھے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ تیسری صدی میں بہت سے معتزلی صوفی بھی تھے۔ مثلاً ابوسعید الحصری الصوفی اور ابوموسیٰ عیسیٰ ابن ہیثم الصوفی۔ یہ دونوں اپنے زمانے کے نامور معتزلی علماء میں تھے۔ مگر جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے صوفی بھی تھے۔ ان کے ہمعصر معتزلی علماء کا قول یہ ہے کہ یہ لوگ ابتداء میں تو معتزلی ہی تھے۔ مگر بعد ازاں ان کے خیالات میں فساد پیدا ہو گیا۔ ابن ندیم کا خیال ہے کہ ابوحفص کا شمار بھی اسی قبیل کے معتزلہ میں تھا۔

ان باتوں کے باوجود جنید ابوحفص کے تبحر علمی کے معترف تھے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ "وہ ان عرفاء میں سے تھے جو حقیقتِ ایزدی کا مفہوم سمجھتے ہیں اور وہ بلاشبہ کمال علم و عرفان کے مرتبے پر فائز تھے۔" (تاریخ بغداد) ابوحفص نے ۲۶۵ھ میں وفات پائی۔

یحییٰ ابن معاذ | یہ جنید کے آٹھویں استاد تھے جو معرفت کی تعلیم کے لئے مشہور تھے اور ابویزید (بایزید) بسطامی کے دوست تھے۔ انہوں نے ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔

یوسف ابن حسین | ان کا پورا نام ابویعقوب یوسف ابن الحسین ابن علی الرازی ہے، معقول اور منقول دونوں میں بلند پایہ رکھتے تھے اور تصوف میں شہر رَے کے صوفیوں کے شیخ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بغداد میں ان کے تعلقات امام احمد ابن حنبل سے بھی تھے اور ذوالنون مصری سے بھی۔ جنید نے ان سے بہت استفادہ کیا اور خود جنید کا ان کی نگاہ میں کیا مرتبہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جنید کے بارے میں یہ کہا "ہو سیّد الحکماء والعارفین من اہل عصرہٖ" یعنی جنید اپنے ہم عصر حکماء اور عارفین کے سردار ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء۔ جلد دہم صفحہ ۲۷۰)

تبصرہ | مذکورہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ جنید نے اپنے عصر کے تمام نامور علماء حکماء اور صوفیہ سے استفادہ کیا تھا اس لئے ان کے علم میں غیر معمولی وسعت اور جامعیت پیدا ہو گئی تھی اور چونکہ انہوں نے ذہن رسا پایا تھا اس لئے اس تمام ذخیرۂ علم میں اپنے ذاتی معلومات اور مشاہدات کا اضافہ کر کے اپنا مخصوص فلسفیانہ نظام اور طریق سلوک مدوّن کیا جس میں افکار کے مختلف دھارے مل کر ایک ہو گئے تھے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کو اسلامی لباس پہنایا اور شریعت اور طریقت کو ہم آہنگ کر دیا یعنی انہوں نے شریعت کی اساس پر تصوف کا قصرِ رفیع تعمیر کیا جسے علماء اور صوفیہ دونوں نے اپنا مسکن بنایا۔ اسی لئے انہیں بجا طور پر سیّد الطائفہ کا لقب دیا گیا اور صوفیوں کے علاوہ ابن تیمیہ اور ابن القیم جیسے مخالف تصوف علماء نے بھی ان کے طریق تصوف (طریقہ) کو مستند قرار دیا اور ان کا تذکرہ بڑے احترام سے کیا ہے۔ (دیکھو منہاج السنۃ لابن تیمیہ جلد سوم صفحہ ۸۵ اور مدارج السالکین لابن القیم جلد ۲ صفحہ ۱۲۷)

بغداد کا دبستانِ تصوف

ھم سری سقطی اور حارث محاسبی کو بجا طور پر اس دبستان کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ دونوں اہل سنت والجماعت تھے اور ان کی تعلیمات کا مرکزی تصور عقیدہ توحید تھا۔ چنانچہ ان کے ہمعصر علماء انہیں "ارباب توحید" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ لیکن یہ حضرات اس موضوع پر اس قدر بلند مقام سے گفتگو کرتے تھے کہ وہ عوام الناس کی فہم سے بالاتر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات عام مجالس میں گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے گھروں میں مخصوص لوگوں کے سامنے توحید کے اسرار و رموز بیان کرتے تھے۔ ابوطالب مکیؒ کا قول ہے کہ جنید کی نجی مجلسوں میں زیادہ سے زیادہ بیس افراد ہوتے تھے اور آخر عمر میں وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اب لوگوں میں توحید کے حقائق و معارف حاصل کرنے کا شوق بہت کم ہو گیا ہے (قوت القلوب صـ۲۱)

جنید کی وفات سے کچھ پہلے یعنی تیسری صدی کے آخر میں صوفیوں کے متعلق بدگمانی کا آغاز ہو گیا تھا۔ فقہا ان پر زندقہ اور الحاد، اتحاد اور حلول کے الزامات عائد کرنے لگے تھے۔ خود جنید بھی مورد الزام تھے۔ اور بعض علما اور فقہا انہیں بھی شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب الموفق خلیفہ بغداد کے دربار میں تحقیق احوال کے لئے صوفیہ کو طلب کیا گیا تو جنید نے یہ کہہ کر اپنی جان بچائی کہ میں اصلاً محدث اور فقیہہ ہوں (دیکھو قشیری صـ۱۲ اور تلبیس ابلیس صـ۱۶۲)

بہرحال اس قسم کے واقعات کی بنا پر جنید نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنی تعلیمات کو مخصوص لوگوں تک محدود رکھا۔ بلکہ اسی لئے انہوں نے ہر شخص پر اس بات کو واضح کیا کہ در اصل تصوف قرآن و حدیث پر مبنی ہے۔ چنانچہ ان کا یہ مقولہ تمام متاخرین نے نقل کیا ہے کہ "ہمارا طریقہ کتاب و سنت سے ماخوذ ہے"۔

جنید کے احباب اور تلامذہ

جنید کے احباب اور ہم نشینوں میں حسب ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:

(۱) ابوالحسین احمد ابن محمد النوری۔ خراسانی الاصل تھے۔ مگر بغداد میں پیدا ہوئے۔ جنید کی طرح سری سقطی کے شاگرد اور مرید تھے۔ مگر چونکہ جنید کی طرح محتاط نہ تھے اس لئے آخر عمر میں حارث محاسبی کی مانند انہوں نے بھی دکھ اٹھایا۔ ۲۹۵ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابوسعید الخرّاز۔ یہ بھی سری سقطی کے شاگرد تھے اور ان چند بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے تصوف پر کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ان کی کتاب الصدق کا تذکرہ پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔

(۳) ابوالعباس احمد ابن محمد ابن عطاء العدی۔ مدت دراز تک جنید کے ساتھ بڑے گہرے روابط رہے مگر آخر عمر میں اس مسئلے پر اختلاف ہو گیا تھا کہ قیامت کے دن شکر گزار دولت مندوں کا مرتبہ زیادہ بڑا ہو گا یا شکر گزار فقراء کا۔ ابن العطاء دولت مندوں کے حق میں تھے اور جنید فقراء کے۔ انہوں نے ۳۰۹ھ میں وفات پائی۔

(۴) ابو محمد رُوَیم ابن احمد۔ یہ بہت عالم و فاضل صوفی تھے اور علم تفسیر میں سرآمد علماء عصر تھے۔ جب رویم نے عہدہ قضا قبول کر لیا تو تعلقات ختم ہو گئے۔ انہوں نے ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔

(۵) ابو حمزہ محمد ابن ابراہیم البغدادی۔ یہ صاحب سری سقطی کے دوستوں میں سے تھے اور صوفیائے بغداد کے سرتاج تھے۔ یہ پہلے صوفی ہیں جنہوں نے پبلک جلسوں میں تصوف پر تقریریں کی۔ ۲۶۹ھ میں وفات پائی۔

(۶) ابوعبداللہ عمرو بن عثمان المکی۔ یہ بغداد کے صاحب ثروت خاندان سے تھے۔ لیکن جب انہوں نے قاضی کا عہدہ قبول کر لیا تو جنید نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ یہ حلاج کے پہلے مرشد اور استاد تھے۔ انہوں نے جنید سے ایک سال پہلے ۲۹۷ھ میں وفات پائی۔

(۷) ابوالحسن محمد ابن اسمٰعیل خیر النساج۔ یہ سری سقطی کے مرید اور شاگرد تھے۔ جنید ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بقول ہجویریؒ و قشیریؒ، جنید کہا کرتے تھے کہ نساج ہم میں بہترین شخص ہیں۔ شبلیؒ اور خواصؒ نے انہی کے فیض صحبت سے مسلک تصوف اختیار کیا تھا۔

(۸) ابو احمد مصعب القلانسی۔ تصوف میں جنید کے ہمسر تھے اور ابوسعید العربی کے مرشد تھے۔ ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

(۹) ابوالحسن سمنون ابن حمزہ۔ سقطی اور القلانسی کے ہم نشین تھے۔ جنید سے بہت محبت کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے انہوں نے بھی ۲۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۱۰) ابوالعباس احمد ابن مسروق اور ابو جعفر الحدّاد الجبیری بھی جنید کے خاص رفقاء میں سے تھے۔

جنید کے شاگردوں کا تذکرہ

(۱) ابو محمد احمد ابن الحسین الجریری۔ جنید کے شاگردوں میں بلند ترین مرتبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ جب جنید کی وفات کے وقت شاگردوں نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہو گا؟ تو انہوں نے الجریری کو نامزد کیا۔ یہ تصوف کے علاوہ حدیث اور فقہ میں بھی مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابوبکر دولف ابن جحدر الشبلی۔ جوانی میں خلیفہ بغداد کے مصاحب تھے۔ مگر نساج کی صحبت میں بیٹھ کر تائب ہو گئے اور انہی کے حکم سے جنید کی شاگردی اختیار کر لی۔ تصوف کا نشہ ایسا چڑھا کہ بغداد کے لوگوں میں خبطی مشہور ہو گئے۔ ایک دن جنید کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں مغموم پا کر سبب دریافت کیا۔ جنید نے کہا: "جو جستجو کرے گا وہ پائے گا"۔ انہوں نے کہا: "نہیں جو پائے گا وہ جستجو کرے گا"۔ شبلی کو حلاج سے بہت محبت تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے حلاج کی حمایت نہیں کی۔ انہوں نے ۳۳۴ھ میں وفات پائی۔

(۳) ابوالمغیث الحسین ابن منصور الحلاج۔ انہوں نے جنید کے شاگردوں میں سب سے زیادہ شہرت پائی۔ فارسی، اردو، سندھی اور پنجابی زبان کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے ان کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ ان کا اصلی نام حسین تھا مگر شہرت

باپ کے نام سے پائی۔ شعرا کی بدولت منصور اور سرمد کو شہرت دوام اور حیاتِ جاوید حاصل ہوگئی۔ ان کی ولادت تستر میں ہوئی اور سن شعور کو پہنچ کر حضرت سہل تستری کی شاگردی اختیار کی۔ بعد ازاں بغداد آئے اور عمرو ابن عثمان المکی کے مریدوں میں داخل ہوگئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان سے قطع تعلق کرکے جنید کے حلقۂ مریدین میں شامل ہونے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چونکہ انہیں معلوم تھا کہ حلاج، المکی کے شاگرد ہیں، اس لئے انہوں نے آنے کا سبب پوچھا۔ حلاج نے کہا "آپ کی صحبت میں بیٹھ کر استفادہ چاہتا ہوں۔" جنید نے کہا "مگر میں تو مجنوط الحواس لوگوں کو اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ صحبت اور ملاقات کے لئے باہوش ہونا تو شرط اولین ہے۔ اگر تم صاحب ہوش (خودمند) ہوتے تو سہل تستری اور عثمان مکی کے ساتھ تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا۔" حلاج نے جواب دیا "اے شیخ! صحو (ہوش) اور سکر (بے ہوشی) انسان کی دو صفتیں ہیں اور جب تک انسان کی صفات فنا نہ ہو جائیں وہ خدا سے محجوب و مستور رہتا ہے۔" جنید نے کہا "اے ابن منصور! تم صحو اور سکر کا مفہوم نہیں سمجھے۔ اول الذکر (صحو) تعلق باللہ کی صحیح کیفیت کا نام ہے۔ آخرالذکر (سکر) اشتیاق کی شدت اور عشق کی انتہا کو کہتے ہیں اور ان میں سے کوئی حالت بھی انسانی کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اے ابن منصور! تمہاری گفتگو میں جہالت اور حماقت کا رنگ جھلکتا ہے۔" (ہجویری صہ ۱۸۹)

عمرو ابن عثمان المکی نے حلاج کے بارے میں ایک دن کہا "اگر وہ مجھے مل جائے تو میں اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں" لوگوں نے سبب دریافت کیا تو جواب دیا "ایک دن میں قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا اسے سن کر حلاج نے کہا میں بھی ایسی آیت تصنیف کر سکتا ہوں۔" (تاریخ بغداد جلد ۸۔ صفحہ ۱۲۱) اگرچہ حلاج کی تعلیمات جنید کی تعلیمات سے مشابہ تھیں لیکن اس نے توحید الٰہی کا عقیدہ ایسے انداز میں پیش کیا جس سے بہت سے مسلمان متوحش اور مضطرب ہوگئے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الطواسین میں توحید کا خلاصہ "انا الحق" کے لفظوں میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسے جرم الحاد میں گرفتار کیا گیا تو بغداد کے بہت سے شیوخ تصوف نے اس سے بیزاری کا اعلان کیا اور حمایت کے بجائے مخالفت کی۔

الخطیب بغدادی صاحب تاریخ بغداد بیان کرتا ہے کہ حلاج نے اپنے ایک دوست کو اس طرح خط لکھا "خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے الخ" جب یہ خط اسے دکھایا گیا تو اس نے کہا "ہاں یہ خط میں نے لکھا ہے۔" اس پر اس سے کہا گیا کہ یہ لکھ کر تو تم نے اپنی الوہیت کا دعویٰ کیا ہے تو اس نے جواب دیا "میں نے اپنی الوہیت کا اعلان نہیں کیا بلکہ یہ وہ بات ہے جسے ہم اہل تصوف مشیت ایزدی کے ساتھ اتحاد کامل (عین الجمع) کہتے ہیں۔ دراصل کاتب رسالہ خدا ہے۔ میں اس کے ہاتھ میں صرف ایک آلہ ہوں۔" اس پر قاضی نے دریافت کیا "دوسرے صوفی بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں؟" اس نے کہا "ہاں ابن عطاء، ابو محمد الجریری اور ابوبکر شبلی کا بھی یہی عقیدہ ہے۔" چنانچہ ان تینوں کو عدالت میں طلب کیا گیا۔ جریری اور شبلی دونوں نے تقیہ سے کام لیا اور انکار کر دیا مگر ابن عطا نے اقرار کیا اور قتل کی سزا پائی (تاریخ بغداد جلد ۸ صفحہ ۱۲۷)

پروفیسر نکلسن نے حلاج پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے "حلاج اپنے عقائد میں اس درجہ مخلص تھا کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف کتمان حق نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں لوگوں کو اس کے بارے میں قوی شبہات تھے کہ وہ قرامطہ سے روابط رکھتا ہے۔ اس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اپنے عقیدے کی تبلیغ کی۔ اس لئے علماء اس کی تکفیر میں حق بجانب تھے۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے راز الوہیت کو فاش کر دیا بلکہ اس نے ایسے عقیدے کی تبلیغ کی جس کا لازمی نتیجہ مذہبی، سیاسی اور عمرانی انتشار اور بدنظمی تھا۔" (ورثہ اسلام صفحہ ۲۱۸)

جنید کے دوسرے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:۔

جعفر الخلدی، ابوسعید العربی، ابو علی احمد رودباری، ابوبکر محمد ابن الکتانی، ابوالحسن علی ابن محمد المزین، ابو محمد عبداللہ ابن محمد المرتعش اور ابو یعقوب اسحٰق ابن محمد النہرجوری۔

حقیقت یہ ہے کہ بغداد تیسری صدی میں اسلامی دنیا کا روحانی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ اور یہاں کا دبستان تصوف پورے تصوف کا نمائندہ تھا۔ خراسان سے لے کر شام، مصر، عرب اور افریقہ تک کا تصوف اس دبستان سے متاثر ہوا۔ ابوطالب کی اپنی تصنیف قوت القلوب میں لکھتے ہیں "ہمارے شیخ ابوسعید ابن العربی نے اپنی تصنیف طبقات النساک میں لکھا ہے کہ بغداد کا دبستان تصوف سب سے آخر میں قائم ہوا اور آخری شیخ جس نے علم تصوف کو مدون کیا جنید تھے۔ وہ بڑی دوررس نگاہ رکھتے تھے۔ حامل حقیقت و صداقت تھے اور اس کے اظہار پر قدرت بھی رکھتے تھے۔ ان کے بعد دوسرے کا نام لیتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔" (قوت القلوب جلد دوم صفحہ ۱۹۱)

جنید کی شخصیت

جنید کی شخصیت کی تشکیل دو باتوں کی رہین منت ہے۔ ان کی ذاتی صلاحیت و قابلیت اور ان کے ماموں سری سقطی کی تربیت۔ انہوں نے جنید کی ذاتی صلاحیتوں کو ابھارنے میں اپنی پوری توجہ اور کوشش صرف کی تھی اور اس جوہر قابل کی تربیت اس انداز سے کی کہ جنید کو تصوف کا امام بنا دیا۔ اس فن میں ان کا وہی مرتبہ اور مقام ہے جو فقہ میں امام اعظم ابوحنیفہ کو حاصل ہے۔

جب جنید کی عمر سات سال کی ہوئی تو انہوں نے اس طفل ذہین کو عوام کے ساتھ اختلاط[1] سے روک دیا ان کی تعلیم

[1] ہمارے زمانے میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی، شاگرد رشید قطب الارشاد و المکوین حضرت مولانا الحاج الحافظ رشید احمد صاحب گنگوہی کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی تھی۔ جب ان کی عمر سات سال کی ہوئی تو ان کے والد مرحوم نے ان کو حکم دیا کہ وہ بغیر اجازت گھر سے باہر نہ نکلیں اور نہ کسی شخص سے خواہ وہ بچہ ہو یا جوان، گفتگو کریں اور نہ کوئی کتاب پڑھیں (مؤلف)

کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب علما اور مشائخ سقطی کے حلقہ درس میں جمع ہو جاتے تھے تو وہ جنید کو اپنے پاس بٹھا کر سقراطی انداز میں ان سے سوالات کرتے تھے اور ان کے جوابات کی تصحیح کرتے تھے۔ پھر ان سے کہتے تھے کہ اب جو گفتگو میں حاضرین مجلس سے کروں تم اُسے غور سے سنو۔ آخر میں ان کا امتحان لیتے تھے۔

جب جنید بارہ سال کے ہوئے تو باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے انہوں نے بغداد کے مشہور فقیہہ ابوثور سے علم فقہ حاصل کیا اور دوران تعلیم میں انہوں نے اپنی جودتِ طبع، ندرتِ فکر، ذہانت و فطانت، حاضر دماغی اور نکتہ سنجی کا غیر معمولی مظاہرہ کیا۔

تحصیل فقہ کے بعد انہوں نے تمام علوم متداولہ میں مہارت حاصل کی اور تعلیم سے فارغ ہو کر ریشم کی تجارت کو ذریعہ معاش بنایا، تاکہ کسی مربے کے آگے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہ آئے۔ ان کی زندگی میں ہر اعتبار سے اعتدال کا رنگ کارفرما تھا۔ ان کا مکان صوفیہ اور علماء کا مرکز توجہ بن گیا تھا۔ ناممکن تھا کہ کوئی عالم یا صوفی بغداد آئے اور ان کی محفل میں شریک نہ ہو۔

اس زمانے کے صوفی عموماً سیاحت کیا کرتے تھے۔ مگر جنید نے ایک سفر حج کے علاوہ کوئی سفر نہیں کیا۔ حج کا جو مفہوم ان کے ذہن میں جاگزیں تھا اس کی وضاحت اس گفتگو سے ہو سکتی ہے جو ان کے اور ایک حاجی کے درمیان ہوئی۔

ایک دن ایک شخص ان سے ملنے آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حج سے واپس آیا ہے۔ انہوں نے اُس سے پوچھا، کیا جب سے تم حج کے لئے گھر سے نکلے، گناہوں سے بھی مجتنب ہو؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ یہ سن کر جنید نے کہا "تم نے سفر ہی نہیں کیا۔" پھر پوچھا "دوران سفر میں جب تم کسی سرائے میں شب گذارنے کے لئے مقیم ہوئے تو تم نے اُس رات کوئی مقام قرب طے کیا؟ اس نے کہا "نہیں۔" جنید نے کہا "تو تم نے منزل بمنزل سفر طے نہیں کیا۔ پھر پوچھا "جب تم نے احرام باندھا تو سابقہ لباس کے ساتھ ساتھ انسانی صفات مثلاً خود بینی، تکبر، بُغض، حسد، حرص وطمع کو بھی دور کیا؟ اس نے کہا، نہیں۔ جنید نے کہا "تو تم نے احرام ہی نہیں باندھا۔ پھر پوچھا جب تم نے عرفات کے میدان میں وقوف کیا تو مراقبۂ ذاتِ باری کیا؟ اس نے کہا نہیں۔ جنید نے کہا "تو تم نے وقوف ہی نہیں کیا۔" پھر پوچھا "جب تم مزدلفہ گئے اور دلی آرزو حاصل کی تو تمام نفسانی خواہشات سے قطع تعلق کیا؟ اس نے کہا نہیں۔ جنید نے کہا تو تم نے مزدلفہ ہی نہیں دیکھا۔ پھر پوچھا۔ جب تم نے خانہ کعبہ کا طواف کیا تو جمالِ ذاتِ باری کا مشاہدہ کیا؟ اس نے کہا۔ نہیں۔ جنید نے کہا تو تم نے سرے سے طواف ہی نہیں کیا۔ پھر پوچھا۔ جب تم نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تو مقام صفا حاصل کیا یا نہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ جنید نے کہا تو تم نے سعی کی ہی نہیں۔ پھر پوچھا جب تم منا میں آئے تو تم نے اپنی نفسانی خواہشات کو قربان کیا؟ اس نے کہا نہیں۔ جنید نے کہا "تو تم منا میں گئے ہی نہیں اور قربانی بھی نہیں کی۔ پھر پوچھا "جب تم نے رمی جمار کی تو ان کنکریوں کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات کو بھی دل سے نکال کر دور پھینکا؟ اس نے کہا۔ نہیں۔ جنید نے کہا تو تم نے رمی کی ہی نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تم نے سرے

سے حج ہی نہیں کیا۔ واپس جاؤ اور دوبارہ حج کرو جس طرح میں نے بتایا ہے۔ تاکہ مقام ابراہیمی حاصل کر سکو۔ (کشف المحجوب از ہجویری ۔ صفحہ ۳۲۸)

جنید کے گھر میں ایک خادمہ تھی جس کا نام زیتونہ تھا۔ وہ نہایت نیک اور وفادار تھی۔ جنید اور ان کے دوستوں کی خدمت بڑے خلوص سے کرتی تھی۔ جنید کو اللہ نے نہایت اعلیٰ درجے کی صحت عطا کی تھی۔ اکل و شرب میں حد درجہ محتاط تھے اسی لئے ساری عمر بیمار نہیں ہوئے۔ چونکہ جسمانی طور پر بہت طاقتور تھے اس لئے بعض لوگوں کو ان کے صوفی ہونے کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔

انہوں نے ساری عمر قیادت اور سیاست سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اور اس خیال سے کہ مبادا ارباب حکومت کو ان پر اعتراض کا موقع ملے۔ انہوں نے ساری عمر "پبلک اسپیچوں" سے پرہیز کیا (جس طرح ذیابیطس کا مریض شکر سے کرتا ہے)۔ نہ ساری عمر کسی قرمطی کو اپنی محفل میں آنے دیا اور نہ خود کسی قرمطی سے ملنے گئے۔ اُن کے زمانے میں منطق، فلسفہ اور الٰہیات میں ان دسیسہ کاروں کی بڑی شہرت تھی۔ لیکن جنید ان کی باطنی خباثت سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے ان منافقوں سے ہمیشہ دور ہی رہے اور جب اہلِ زنادقہ[1] اور ملاحدہ کی مخفی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کی بدولت تصوف بدنام ہوا، اور مشکوک صوفیہ پر حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ اور دار و گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو جنید نے عدالت میں حاضر ہو کر صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ "میں تو اصلاً ایک فقیہہ اور محدث ہوں۔ ہاں تزکیۂ نفس کی اہمیت عوام پر واضح کرتا رہتا ہوں۔ میرا تصوف مقیدٌ بالکتاب والسنت ہے جو بات قرآن اور حدیث سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ جب حلاج نے "انا الحق" کا نعرہ بلند کیا تو جنید نے اُسے اپنے یہاں آنے سے منع کر دیا۔ اور قطع تعلق کر لیا۔ اُن کی زندگی کے آخری دور میں جب بعض صوفیہ کی غلط روش اور حد شرع سے بڑھی ہوئی گفتگو کی بنا پر علماء نے ان کے خلاف فتوے دیئے اور حکومت نے باز پرس کی اور مجرموں کو سزائیں دیں تو جنید بہت غمگین ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو نصیحت کی کہ تصوف کے وہی مسائل عوام کو سکھائیں جو مطابق شرع ہوں اور ایسا کوئی مسئلہ بیان نہ کریں جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ چنانچہ جب ان کے شاگرد شبلی نے انہیں ایسا خط لکھا جس میں اسرار توحید فاش کر دیئے تھے تو انہوں نے اس خط کی پشت پر یہ عبارت لکھ کر

[1] بقول علامہ ابن الجوزی "ان کے عقائد و اعمال سب اسلام سے بالکل مخالف ہیں۔" طائفہ خناگہ اسمعیلیہ میں سے جو لوگ حمدان قرمط کے پیرو بن گئے۔ وہ قرامطہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ لوگ حلول اور تجسیم دونوں غیر اسلامی عقیدوں کے قائل ہیں۔ حضرت علیؓ کو خدا یا خدا کا اوتار یقین کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی روح ان کے جانشینوں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس لئے سارے ائمہ "خدا کا اوتار" تھے۔

وہ خط واپس کر دیا "اے ابوبکر! اس قسم کی تحریر سے اجتناب کرو۔" (کتاب اللمع۔ صفحہ ۲۳۳)

جنید ایک ماہر فن طبیب کی طرح بخوبی جانتے تھے کہ عوام کے لئے کون سی تعلیم مناسب ہے۔ اس کا ثبوت ابوالحسن نوری کے اس بیان سے مل سکتا ہے کہ "میں ایک دن جنید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ مسندِ درس پر جلوہ افروز تھے۔ درس کے بعد میں نے کہا "اے ابوالقاسم! اگرچہ آپ نے لوگوں سے حق کو پوشیدہ رکھا لیکن انہوں نے آپ کو عزت دی۔ میں نے ان پر حق واضح کیا مگر انہوں نے مجھے پتھروں سے نوازا۔" (کشف المحجوب صفحہ ۱۳۱)

جنید کا مسلک یہ ہے کہ تصوف سراسر اسلام پر مبنی ہے۔ انہوں نے ساری عمر اس دعوے کو ثابت کرنے میں بسر کر دی اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے ساری عمر شریعت کی پابندی کی۔ فرائض کے علاوہ سنن اور نوافل بھی بکثرت پڑھتے تھے۔ تلاوتِ کلام اللہ ان کا معمولِ حیات تھا۔

ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ تادمِ وفات اتباعِ شریعت میں مشغول رہے (دیکھو کشف المحجوب صفحہ ۲۰۳ نیز کتاب اللمع صفحہ ۲۱۰)

وہ ایک متبحر عالم تھے۔ ذہانت اور فطانت میں بے مثال تھے۔ تمام عصری علوم سے آگاہ تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، کلام، عقائد، الٰہیات، اخلاق اور تصوف کے مسائل پر مجتہدانہ شان سے گفتگو کرتے تھے ان خوبیوں پر مستزاد امر یہ تھا کہ ہمیشہ تزکیۂ نفس، مجاہدات اور ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔

اگر کوئی شخص ان سے کسی صوفیانہ حال یا مقام کے بارے میں دریافت کرتا تھا تو وہ خلوت میں جا کر مراقبہ کرتے تھے اور دھیان کے بعد جو کیفیات حاصل ہوتا تھا، جسے مشاہدۂ ذاتی کہہ سکتے ہیں، اسے سائل کے سامنے بیان کرتے تھے۔

چنانچہ ان کے شاگرد رشید ابو جعفر خلدی کا قول ہے کہ "ہم جنید کے علاوہ کسی ایسے صوفی کو نہیں جانتے جس نے عقل اور عرفان، علم کتابی اور مشاہدۂ ذاتی کو اس طرح اپنی زندگی میں جمع کر لیا ہو۔ بغداد میں بہت سے علماء ہیں جو علم ظاہری میں ماہر ہیں مگر معرفت سے بیگانہ ہیں۔ اسی طرح بہت سے شیوخ ہیں جو علوم باطنی میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ مگر علوم عقلی و شرعی سے بیگانہ ہیں۔ لیکن جنید دونوں علوم کے جامع ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کا علم ان کے عرفان سے بڑھا ہوا ہے۔"

خلدی نے جو کچھ کہا اس پر اب کوئی شخص کسی قسم کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ سوائے اس بات کے کہ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک دوسرا سید الطائفہ پیدا نہیں ہوا ہے۔

جنید کی تصانیف

جنید اپنے استاد محاسبی کی طرح کثیر التصانیف نہیں تھے۔ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) کتاب امثال القرآن (۲) کتاب رسائل۔ ابو نصر سراج نے اپنی تصنیف کتاب اللمع میں ان کی ایک تصنیف "شرح شطحیات ابی یزید البسطامی" سے چند اقتباسات درج کئے ہیں۔ ہجویری نے کشف المحجوب میں ان کی چوتھی تصنیف "تصحیح الارادہ" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آج ان کی صرف دو کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ایک تو رسائل جنید اور دوسری کتاب ان کے چند رسائل ہیں جو حلیۃ الاولیاء میں شامل ہیں۔

رسائل جنید میں جو ۱۹۶۲ء میں لندن سے شائع ہوتے ہیں، حسب ذیل رسائل شامل ہیں۔

(۱) رسالہ الی بعض اخوانہ (۲) رسالہ الی یحییٰ بن معاذ الرازی (۳) رسالہ الی بعض اخوانہ (۴) رسالہ الی ابی بکر الکسائی الدینوری (۵) رسالہ بغیر عنوان (۶) رسالہ الی عمرو بن عثمان المکی (۷) رسالہ الی یوسف بن حسین الرازی (۸) دواء الارواح (۹) کتاب الفناء (۱۰) کتاب المیثاق (۱۱) کتاب فی الالوھیۃ (۱۲) کتاب فی الفرق بین الاخلاص والصدق (۱۳) باب آخر فی التوحید (۱۴) مسئلۃ اخری فی التوحید ۱۵ تا ۱۹ بھی اسی موضوع پر ہیں (۲۰) آخر مسئلۃ (۲۱) ادب المفتقر الی اللہ۔

ہم آئندہ اوراق میں جنید کی بنیادی تعلیمات انہی رسائل سے اخذ کر کے ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ (جاری)

نیکی میں سبقت : بقیہ صفحہ ۵۶

آمادہ؟ پھر آپ نے اس پاکیزہ جسم کو قبر میں رکھ کر جب یہ دعا فرمائی "اے اللہ میں عبد اللہ رضؓ سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا" تو کہتے ہیں دل اس تمنا سے تڑپ اٹھے کہ کاش ہم اس قبر میں دفن ہوتے۔ یہاں تک کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود تو زبان قال سے پکار اٹھے "یا لَیْتَنِیْ کُنْتُ صَاحِبَ الْحُفْرَۃِ" ۔ کاش میں اس قبر میں دفن ہوتا۔

غرضیکہ اس معاشرہ میں نیکی کی دوڑ میں کوئی مال کے ذریعہ آگے بڑھ رہا ہے۔ کوئی شجاعت و بہادری کی راہ سے بازی جیت رہا ہے کوئی امتثالِ امر کے ذریعہ میدان مار رہا ہے کوئی ہجرت کے ذریعہ سبقت لئے جا رہا ہے کوئی جان دے کر جنت خرید رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی یہی تمنا ہے کہ وہ کمال اطاعت سے اطاعتِ رسول کا حق ادا کر دے اور اپنے جان و مال، خیالات و جذبات کی قربانی دے کر اللہ کی رضا کو پالے۔ فی الحقیقت نیکی میں سبقت کا جذبہ اسلامی معاشرہ کی جان ہے اور جب تک کسی معاشرہ میں یہ جذبہ دوسرے تمام جذبات پر حاوی نہ ہو جائے کوئی مسلمان معاشرہ صحیح اسلامی معاشرہ کہلانے کا ہرگز حقدار نہیں بن سکتا۔

ہم سے طلب فرمائیے

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر ترین لیکن جامع ترین کتاب

النبیّ الخاتم

تالیف : مولانا سید مناظر احسن گیلانی

سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۱۸۰ : کاغذ سفید : قیمت -/۳ روپے

حقیقت خلافت و ملوکیت

تالیف : علامہ سید محمود احمد عباسی

— سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیف —

خلافت و ملوکیت کا مسکت جواب

مستند تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

سائز ۳۶×۲۳/۱۶ صفحات ۵۶۸ : مجلّد

قیمت قسم اوّل سفید کاغذ مع ڈسٹ کور -/۱۱ روپے

" " دوم نیوز پرنٹ ۶/۷۵ "

تحقیق مزید

مؤلفہ : علامہ سید محمود احمد عباسی

بسلسلہ خلافت معاویہؓ و یزیدؒ

بڑی تقطیع ۔ صفحات ۵۰۴ مجلّد

قیمت : آٹھ روپے

(محصول ڈاک اس کے علاوہ)

★

انوارِ مجدّدی

یعنی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشی مفیدہ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات : ۳۸۴ مجلّد مع ڈسٹ کور

قیمت : چار روپے صرف

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبّرِ قرآن

جلد اول ——— مشتمل بر

مقدمہ و تفاسیر آیۂ بسم اللہ ، سورۃ فاتحہ ، سورۃ بقرہ و سورۃ آل عمران

"............... بڑی ہی فکر انگیز اور اپنے رنگ میں بالکل منفرد تفسیر............... اہل علم اور طلبۂ فن کے مطالعے میں رہنے کے قابل اور بہتوں کے لئے ایک قابل قدر رہنما... عبارت متین و محکم ، شستہ و سلیس ، شاندار اور باوقار ، مولویانہ نہیں ادیبانہ... مصنف زندگی بھر اور کچھ نہ کرتے صرف یہی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑ جاتے تو بھی خدمت قرآن کا حق ادا کر جاتے"
(مولانا عبدالماجد دریابادی ، مدیر 'صدق جدید')

سائز ۲۹×۲۲/۸ ، صفحات ۸۸۰

عمدہ دبیز سفید کاغذ ——— آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ تیس روپے ——— محصول ڈاک : ڈھائی روپے

(بتیس روپے پچاس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں)

★

شائع کردہ

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ـ 1 (فون 69522)